عتیق احمد جیلانی :

"معارف" اور اقبالیات

" تحقیق " شمارہ ۲ میں " معارف اور غالبیات" کے عنوان سے ہمارا ایک مضمون شایع ہو چکا ہے ، جس کا مقصد یہ تھا کہ غالبیات کے ضمن میں "معارف" کی خدمات کا جائزہ لیا جائے۔ اور اب اسی نوعیت کا ایک اور مضمون پیشِ خدمت ہے۔ اس مرتبہ ہمارے پیشِ نظر "معارف" کا ذخیرۂ اقبالیات ہے۔ اس سے پہلے متعدد صاحبانِ تحقیق و تنقید اقبال اور "معارف" یا اقبال اور سید سلیمان ندوی کے تعلقات پر روشنی ڈال چکے ہیں ، مگر ان کے اور ہمارے کام میں ایک نوع کا فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے مطالعے کا موضوع شخصی کم اور فکری زیادہ ہے۔ جب کہ ان کتب اور مقالات میں بنیادی اہمیت اِن مشاہیر کے ذاتی روابط کو حاصل ہے۔ مذکورہ مقالوں کی تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) " اقبال اور سید سلیمان ندوی" ، از ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، تحریر ۱۹۵۶ء ، مشمولہ مطالعۂ اقبال ، مرتبہ گوہر نوشاہی ، بزم اقبال لاہور ، ۱۹۷۱ء۔

(۲) " رسالہ معارف اور اقبال" ، از ڈاکٹر نجم الاسلام ، مشمولہ " نقوش " لاہور ، جون ، ستمبر ۱۹۷۷ء۔

(۳) " اقبال ، سید سلیمان ندوی کی نظر میں" ، مرتبہ اختر راہی ، بزمِ اقبال لاہور ، مارچ ۱۹۷۸ء۔

(۴) "اقبال اور سید سلیمان ندوی"، مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۹ء۔

متذکرہ تحاریر میں سے ڈاکٹر نجم الاسلام کا مقالہ ہمارے موضوع سے نزدیک تر ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون کے حصہ اول میں "معارف" کی ابتدائی دس جلدوں کا جائزہ لیا ہے۔ ہمارے مرتب کردہ جائزے کا محرک بھی یہی مقالہ ہے۔ فی الوقت "معارف" کی ابتدائی سو جلدیں پیشِ نظر ہیں۔ باقی جلدوں میں موجود اقبالیات کے سرمائے پر گفتگو انشاء اللہ آئندہ ہوگی۔

اقبال کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے "معارف" میں جو تعزیتی شذرہ تحریر کیا، اس کا یہ حصہ قابلِ غور ہے۔[۱]

> "اقبال کی تصنیفات زمانے میں یادگار رہیں گی۔ وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ زندہ رہے گا۔ ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، نظریے اُن سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی۔ قرآنِ پاک کی آیتوں، احادیثِ شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اقبال زندۂ جاوید"۔

اِس عبارت میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ 'اقبالیات' علم و ادب کا ایک علیحدہ شعبہ ہے اور دوسری بات یہ کہ 'اقبالیات' کی تکمیل کے لیے راہِ عمل کیا ہونی چاہیے۔ سید سلیمان ندوی نے

۱۔ "معارف" مئی ۱۹۳۸ء، جلد ۴۱، شمارہ ۵، ص ۳۲۱۔

نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ وہ رہنما اصول مرتب کر دیے ہیں جن کی روشنی میں "معارف" نے خصوصاً اور دیگر ناقدینِ اقبال نے عموماً اقبال کا اسلامی اور دینی تشخص متعین کیا۔

تعلیماتِ اقبال کی درست تفہیم اور اقبالیات کی اسلامی تشکیل کے ضمن میں سید سلیمان ندوی کا تحریر کردہ ایک اور شذرہ قابلِ توجہ ہے۔ اِقتباس پیش کیا جاتا ہے۔[۱]

> "آج کل ڈاکٹر اقبال کے نام سے متعدد رسائل نکل رہے ہیں اور مجلسیں قائم ہو رہی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اشخاص بھی بتدریج ترقی کرکے منزلِ مقصود کے احاطے میں داخل ہوتے ہیں اور ان کے خیالات بھی اسی تدریج کے ساتھ کمال کے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ہر شے جو ڈاکٹر اقبال کے کلام کے فائل میں نکل آئے وہ ان کی تعلیم ہے تو وہ سراسر غلط ہوگا، بلکہ وہی چیزیں ان کی تعلیمات کے عناصر ہوں گی جن پر ان کے قلم نے ایک مدت کی تلاش کے بعد آرام کی سانس لی اور جس منزل پر پہنچ کر ان کے خیال کے مسافر نے اقامت اختیار کی۔ اس بنا پر آج کل رسالوں کے کارخانوں میں جو مال تیار ہوتا ہے اور اس پر ڈاکٹر اقبال کے نام کا مارکہ لگاکر جو دکان داری کی جا رہی ہے، وہ ہمت افزائی کے لائق نہیں۔"

ہم اپنے اِس مضمون میں دیکھیں گے کہ "معارف" نے کس حد تک

۱۔ "معارف" مئی ۱۹۴۲ء، جلد ۴۹، شمارہ ۵، ص ۳۲۳۔

مدیرِ اول کی متعینہ بنیادوں پر اقبالیات کی عمارت تعمیر کی ہے۔

سہولت کی خاطر اس جائزے کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے، جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

(۱) مقالات۔
(۲) کتبِ اقبال پر تبصرے۔
(۳) مکاتیبِ اقبال۔
(۴) کلامِ اقبال۔
(۵) شعرائے "معارف" پر اقبال کے اثرات۔
(۶) شذرات میں ذکرِ اقبال۔
(۷) متفرقات۔
(۸) نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے۔

"معارف" نے اقبال کی زندگی ہی میں ان کے فلسفے اور شاعری پر مقالوں کی اشاعت کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ مضامین و مقالات اقبال کی تفہیم اور اقبالیات کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ علامہ کی شخصیت اور فنی حیثیت کے مقابلے میں "معارف" نے ان کی فکر اور فلسفے پر زیادہ توجہ دی ہے۔ مذکورہ تحریروں کو باسانی تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) فکرِ اقبال کی تشریح و تعبیر۔
(۲) کلامِ اقبال کی فنی حیثیت کا تعین۔
(۳) اقبال کی شخصیت۔

علامہ کی شخصیت کے حوالے سے صرف دو مضامین ملتے ہیں (۱) اقبال کے چند جواہر ریزے از پروفیسر عبدالحمید (اگست، ستمبر ۱۹۳۸ء، جلد ۴۲، شمارہ ۲—۳)۔ (۲) حضرت سید صاحب

اور ڈاکٹر اقبال از سید صباح الدین عبدالرحمان (جولائی ۱۹۶۷ء، جلد ۱۰۰، شمارہ ۱)۔

کلامِ اقبال کے فنی اور لسانی مطالعے کے ضمن میں تین مقالات ہیں (۱) ڈاکٹر اقبال کی اردو از مولوی محمد محمود زمان (مئی ۱۹۲۸ء، جلد ۲۱، شمارہ ۵)، (۲) کلامِ اقبال کی دقتیں از سید عبداللہ (مارچ، اپریل ۱۹۴۴ء، جلد ۵۳، شمارہ ۳—۴)، (۳) اصلاحاتِ اقبال از محمد بشیرالحق دسنوی عظیم‌آبادی (اگست، ستمبر ۱۹۴۱ء، جلد ۶۴، شمارہ ۲—۳ اور اگست ۱۹۵۲ء، جلد ۷۰، شمارہ ۲)۔ اِن کے علاوہ دیگر درجنوں مقالات کا تعلق افکارِ اقبال کی تشریح و تعبیر سے ہے۔

'تلاشِ حق' علامہ کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ صداقت کی طلب اور سچائی کی جستجو میں اُن کی فکر نے کیسی بادیہ پیمائی اور دشت نوردی کی ہے، اِس کا اندازہ افکارِ اقبال کے ارتقائی مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ اقبال کی حقیقی اور کامل تفہیم کے لیے اس تدریجی تغیر کا پیشِ نظر رکھنا لازم ہے۔ بصورتِ دیگر جزوی حقائق و ناقص نتائج کی تحصیل سے بچنا محال ہے۔ "معارف" کے بیش تر قلم کاروں نے اسی نکتے کو اپنے جائزے اور مطالعے کا محور بنایا ہے۔

حکمائے مغرب سے استفادے میں اقبال نے اپنی 'مشرقی روح' اور دینی بصیرت سے رہنمائی حاصل کی اور صحیح و غلط کا امتیاز قائم رکھا۔ ان کی فکر کا ہر قدم ایسی منزل کی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جہاں پہنچ کر قرآن اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ذات اور شاعری کا بنیادی حوالہ بن جاتے ہیں۔

"معارف" کی نگاہ میں یہی اقبالیات کی اساس ہے اور اس سے ہٹ کر اقبال کو سمجھنے اور پرکھنے کی ہر کوشش لاحاصل اور غیر مقبول ہے۔ اسلام اقبالیات کا محور ہے لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ فکر اقبال کے ہر پہلو اور ہر ارتقائی درجے کو مطابقِ اسلام ثابت کرنے کی سعی کی جائے۔ ان کے ہاں اصل راستے سے انحراف کی جو مثالیں نظر آتی ہیں، غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض تلاش و تحقیق کے مختلف مراحل ہیں۔ انہیں اِسی حیثیت میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔

(۱)

اِس تمہیدی گفتگو کے بعد اب ہم "معارف" کی ابتدائی سو جلدوں میں شامل مقالات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ "معارف" جنوری ۱۹۲۶ء (جلد ۱۷، شمارہ ۱) میں اکرام الحق سلیم کا ایک مضمون بعنوان "فلسفۂ اقبال" شاملِ اشاعت ہے۔ یہ مضمون جزوی طور پر اقبال کے فلسفۂ خودی کی وضاحت سے متعلق ہے، جب کہ زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ عہد حاضر میں مسلم ملت کے لیے اقبال اور کلامِ اقبال کی کیا اہمیت ہے۔ اس مختصر مضمون کے ابتدائی تین صفحات تمہید کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کے بعد تین عنوانات کے تحت شعری اور نثری حوالوں کے ساتھ پیغامِ اقبال کی صراحت کی گئی ہے۔ پہلا عنوان ہے "اخوت و اخلاص" جس میں بتایا گیا ہے کہ اقبال منتشر و پراگندہ ملتِ اسلامیہ کو محبت کے رشتے میں منسلک دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے عنوان "یاس اور حزن" کے تحت اقبال کے پیام حرکت و عمل کی وضاحت کی گئی ہے۔ تیسرا اور آخری عنوان ہے "خود اعتمادی اور خودداری" اس کے ذیل میں جزوی طور پر فلسفۂ خودی کی تعریف متعین کرنے

کے ساتھ ساتھ اس کے تین مدارج کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ زیرِ نظر تحریر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ " اقبال کا فلسفہ خالص اسلامی فلسفہ ہے اور اقبال کا تخیل اور احساس اسلام سے وابستہ ہے"۔ ص ۴۹۔

"معارف" نے ابتدا ہی سے فلسفۂ اقبال کی تفہیم و تعبیر میں خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ جناب اکرام‌الحق سلیم کا مذکورہ مضمون بھی علامہ کی زندگی ہی میں شایع ہوا تھا۔ اگرچہ یہ مضمون نہ پورے طور پر اپنے موضوع کا احاطہ کرتا ہے اور نہ علمی و فکری سطح پر کوئی قابلِ قدر لوازمہ ہی فراہم کرتا ہے، مگر اس کے زمانۂ تحریر کے پیشِ نظر کہنا پڑتا ہے کہ یہ فکرِ اقبال کو سمجھنے کی چند ابتدائی کوششوں میں سے ایک ہے۔ اس لحاظ سے زیرِ نظر مقالے کی افادیت سے انکار بھی ممکن نہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے ' اقبالیات ' کی تشکیل کے ابتدائی دنوں میں جو نکات پیش کیے ہیں وہ آج بھی بنیادی اہمیت کے حامل تسلیم کیے جاتے ہیں۔

۲۔ اقبال پر مغربی مفکرین کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس حوالے سے "معارف" میں شایع ہونے والا پہلا اہم مقالہ مولانا عبدالسلام خاں رام پوری کے قلم کا شاہکار ہے۔ مقالے کا عنوان ہے ' اقبال اور برگساں'۔ ابتدائی نوٹ سے علم ہوتا ہے کہ یہ مضمون ۱۹ ستمبر ۱۹۳۰ء کو صولت پبلک لائبریری رام‌پور کی تقریبِ یومِ تاسیس میں علامہ سید سلیمان ندوی کی زیرِ صدارت پڑھا گیا۔ بعد ازاں اِسے "معارف" فروری، مارچ اور اپریل ۱۹۳۱ء (جلد ۲۷، شمارہ ۲-۳-۴) میں قسط وار شریکِ اشاعت کیا گیا۔ زیرِ نظر

تحریر اقبال اور برگساں کی فکر کے موازنے پر مشتمل ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے نہایت عالمانہ انداز میں اقبال پر برگساں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی دونوں کے درمیان موجود فکری اختلافات کی نشان دھی بھی کی ہے۔ موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۱

"اقبال کا فکری نظام اصولاً تصوری ہے، لیکن اِس میں اِسلام کے عملی رخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انھوں نے تصوریت اور اسلامی عملیت کو ترکیب دے کر اپنے فلسفے کی اساس بنائی ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کی مابعد الطبیعیاتی بنیاد کے لیے ایسی تصوریت کا انتخاب کیا ہے جو تصوریت اور مادیت کے بین بین ہے۔ عموماً مذاہب مادی فلسفے پر قائم نہیں ہوتے۔ مذاہب کی بنیاد کے لیے تصوریت ہی کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہ خالص مادیت پر قائم ہو سکتا ہے اور نہ خالص تصوریت پر۔ غالباً اقبال نے اِسی وجہ سے فرانس کے مشہور فلسفی ہنری برگساں کی مابعد الطبیعیات کو اپنے کلام کی اساس قرار دیا۔ اقبال نے برگسانی مابعد الطبیعیات کو جوں کا توں اختیار نہیں کیا، انھوں نے اس کے بہت سے خلاؤں کو بھی پُر کیا ہے اور نئی چیزوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ پھر بھی دونوں کے نظام ہائے فکر اصولاً ایک ہی ہیں۔

۱۔ "معارف" فروری ۱۹۴۱ء، جلد ۴۷، شمارہ ۲، ص ۹۸۔

دونوں کی ابتدا ایک ہی نقطے سے ہوئی ہے اور دونوں
کا منتہا بھی آخر میں کسی نہ کسی حد تک ایک
ہی ہو جاتا ہے۔"

اس مقالے کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

● — برگساں کے نزدیک کائنات میں جس شے کی واقعیت کا ہمیں سب سے زیادہ علم ہے وہ ہماری ذات ہے اور ہماری ذات کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر لمحے ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ "ایک بظاہر قائم حالت کا ہر حالیہ لمحہ اپنے ما قبل کے لمحے کے شعور اور اس کی یاد پر مشتمل ہوتا ہے"۔ (ص ۱۰۱)

● — برگساں کائنات کو متحرک، سیال اور زندہ فعل سے تعبیر کرتا ہے۔

● — برگساں مدعی ہے کہ کائنات کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا، نہ تکمیل اور نہ کوئی مقصد ہی۔ اس کی نگاہ میں عالم محض ایک غیر مختتم تغیر کا نام ہے۔

● — برگساں وقت کے دو تصور پیش کرتا ہے۔ ایک ریاضیاتی یا طبیعیاتی تصور جو اس کے نزدیک محض وہمی اور خیالی شے ہے اور دوسرا حقیقی یا واقعی۔

● — اقبال کی نظر میں کائنات "ان معنی میں بامقصد ہے کہ وہ نقصان سے کمال اور کمال سے اکملیت کی طرف ارتقائی حرکت کر رہی ہے۔" (ص ۱۷۳)

● — اقبال کے خیال میں ذات کی طرح زمانے کے بھی دو رخ ہیں، ایک باطنی اور دوسرا ظاہری۔

● — اقبال کے نزدیک مکان ایک وہمی شے ہے۔ "اصل ذات بے کثرت ، بے وضع اور بے تعلق ہے ، وہ نہ مکان ہے اور نہ مکانی۔" (ص ۱۷۵)۔

● — اقبال کے خیال میں اشیاء اور افعال ذات کے باطن میں امکانات اور صلاحیتوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ جب تک باطن میں رہتے ہیں 'تقدیر' ہیں اور جب ظاہر ہوں تو 'خلق' ہیں۔ تقدیر ، ذات کی اہلیت اور رسائی کی آخری حد ہے۔

زیر نظر مقالے میں مولانا عبدالسلام خاں رام پوری نے اقبال اور برگساں کے افکار میں درج ذیل مماثلتوں کا ذکر کیا ہے :

● — کائنات کا مبداء ٹھوس اور جامد شے نہیں ہے اِس کی ابتدا محض حرکت ہے۔ یہ حرکت تخلیقی اور ارتقائی ہے۔ انسان اِس ارتقائی حرکت کی آخری ترقی یافتہ صورت ہے۔

● — عقل و فکر کاروباری زندگی سے متعلق ہیں اور حقیقت کے باطن تک رسائی کے لیے وجدان کا سہارا ضروری ہے۔

● — زمانہ اپنے عام تصور کے اعتبار سے غیر حقیقی ہے۔

● — "کائنات کوئی ساختہ پرداختہ شے نہیں ہے ، جس کا خلاق فعلیت سے تعلق ختم ہو گیا ہے یا ہو جائے گا۔" (ص ۱۸۴) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر لمحے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

یہ موازنہ مکمل کرتے ہوئے صاحب مضمون لکھتے ہیں۔۱

"برگساں کے ساتھ ساتھ اقبال کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں کے فلسفیانہ نظام تصوری ہیں۔

۱۔ "معارف" اپریل ۱۹۳۱ء، جلد ۲۷، شمارہ ۴، ص ۲۰۷۔

اِن میں سے مؤخرالذکر کے نظام میں متصوفانہ عنصر زیادہ شامل ہے۔ اقبال کے نظام میں جو انفرادی نقطے ہیں، اُن میں سے اکثر کا اضافہ نظام کی عقلی تکمیل کے لیے نہیں ہے، بلکہ اُن کو محض مذہبی تصورات کی اساس بنانے کے لیے زیادہ کیا گیا ہے۔ اقبال اور برگساں کے بنیادی فرق کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے نظام میں ایک اجمالی اعتبار کی زیادتی ہے، جو برگساں کے یہاں نہیں۔"

۳۔ خواجہ عبدالحمید کا ایک فاضلانہ مقالہ "اقبال، انا اور تخلیق" کے عنوان سے "معارف" کی دو متصل اشاعتوں نومبر، دسمبر ۱۹۴۴ء (جلد ۵۴، شمارہ ۵-۶) میں شایع ہوا ہے۔ مقالہ نگار موضوع کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں۔[۱]

"اقبال کے نظریۂ خودی یا انا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس کے اس نظریے کی طرف کہ بشری انا ایک ایسا فاعل ہے جو اپنے اندر تخلیق و تجدید کی استعداد رکھتا ہے، بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ حالاں کہ انا کا تخلیقی پہلو فلسفۂ خودی کے لیے مرکزی اور بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔"

موضوع پر گفتگو کا آغاز اس نکتے سے کیا گیا ہے کہ اقبال کی نگاہ میں یہ کائنات بحیثیت کل اور بحیثیت جزو حرکت میں ہے۔ قدیم یونانی مفکر ہرقلاطیس نے پہلے پہل کہا تھا کہ "ہر شے بدل رہی ہے، صرف یہ قانون نہیں بدلتا کہ ہر شے بدل رہی

۱۔ "معارف" نومبر ۱۹۴۴ء، جلد ۵۴، شمارہ ۵، ص ۲۱۱۔

ہے۔" اقبال اور ہرقلاطیس کے درمیان اس ظاہری مماثلت کے باوصف بنیادی اختلاف موجود ہے اور وہ یہ کہ ہرقلاطیس تغیر عالم اور انقلاب حیات کے ضمن میں کسی غایت یا مقصد کا قائل نہیں جب کہ اقبال کے نزدیک اس کے پس پشت ایک عظیم مقصد اور غایت کارفرما ہے۔

یہ کائنات دراصل چھوٹے بڑے اناؤں کا مرکب ہے جو انائے کبیر کے تخلیقی کن سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ہر انا اپنے اپنے درجے میں مصروف عمل ہے۔ جو انا ساکن ہوجائے وہ گویا انا کے درجے سے گرجاتا ہے۔ نظام عالم کے لیے حقیقی سرچشمۂ فیض اور منبع قوت وہ انائے کبیر ہے جو تمام مخلوق اناؤں کے مقاصد پر حاوی ہے۔ ہر انا اپنے ماحول سے تعامل کرکے تجربات اور مشاہدات کا ذخیرہ کرتا ہے۔ کامیاب تعامل اسے ارتقا کے اعلا مدارج تک پہنچا دیتا ہے یا بالفاظ دیگر خودی سے آشنا کرتا ہے۔ غرض یہ عالم مقاصد کی آماج گاہ ہے، خواہ یہ مقاصد انائے کبیر سے متعلق ہوں یا انائے صغیر سے۔

بعد ازاں خواجہ عبدالحمید جرمن مفکر لیبنیز (Leibnitz) کے نظریہ جوہر واحد یا موناڈ کا موازنہ اقبال کے نظریہ فرد انا سے کرتے ہیں۔ لیبنیز کے مطابق کائنات بے شمار موناڈوں کا مجموعہ ہے۔ ہر موناڈ اپنی جگہ مستقل حیثیت کا حامل ہے اور دیگر موناڈوں سے تعامل نہیں کرتا۔ البتہ سارے موناڈ، کبیر موناڈ (خدا) کے تابع ہیں۔ جب کہ اقبال کا فرد انا نظام عالم میں دوسرے اناؤں سے تعامل کے ذریعے اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے۔ فاضل مقالہ نگار اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[۱]

۱۔ "معارف" نومبر ۱۹۴۴ء، جلد ۵۴، شمارہ ۵، ص ۲۱۴۔

"یہ مختلف انا ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں؛ ایک دوسرے کو اُبھارتے ہیں؛ گراتے ہیں، فیض بخشتے ہیں اور فیض یاب ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ سب انائے کبیر سے جو اُن کی حیات اور ہستی کا منبع ہے فیض حاصل کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ ادنا درجے کے اناؤں کے لیے تو حصولِ فیضان کی صورت انفعالی اور بالعموم غیر شعوری ہوتی ہے لیکن بشری انا کے ارتقاء کا معیار یہی ہے کہ وہ فاعلانہ طور پر برسرِ پیکار ہو کر اس ربانی فیضان کو جس قدر ہو سکے اپنے اندر جذب کرلے۔"

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فاضل مقالہ نگار بشری انا کی ایک اہم خصوصیت کا ذکر کرتے ہیں جو اُن کے زیرِ نظر مقالے کا موضوع بھی ہے یعنی وصفِ تخلیق۔ یہ صفتِ تخلیق اِس انا کو انائے کبیر کے سوا دیگر اناؤں سے ممتاز اور ممیز کرتی ہے۔ بشری انا اور اس عالم کے درمیان انائے کبیر یا منبعِ روحانیت کے سبب ایک اشتراک موجود ہے۔ لیکن اِس اشتراک کے باوجود بشری انا اس کائنات میں خود کو اجنبی اور بے آسرا و سوگوار محسوس کرتا ہے۔ "وجہ یہ ہے کہ اِس عالمِ موجودات میں بشری انا کا درجہ ان کم رتبہ، خوابیدہ اور از خود نا آشنا، خاموش و بے زبان اور مبہم اناؤں سے بہت بلند ہے جو مل ملا کر مادی دنیا کا نام پاتے ہیں۔" (ص ۲۱۵)۔ یہ ماحول بشری انا کے لیے نہ تو پورے طور پر سازگار اور مناسب ہے اور نہ کاملاً نامناسب اور ناسازگار ہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ماحول میں بشری انا ایک تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور اقبال کے خیال میں یہی کشمکش اور تناؤ انا کی تربیت، تہذیب اور حصولِ خودی کے لیے

درکار ہے۔ اِس ساری پیکار میں انا فاعلانہ طور پر شریک ہے۔ اور مقامِ خودی کی تلاش کا ربانی مقصود حاصل کر رہا ہے۔ یہاں ایک قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ بشری انا ماحول سے تعامل کے دوران اپنی تعمیر کے لیے ضروری اجزاء کا انتخاب کرتا ہے اور اُنھیں اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انا کا رویہ انفعالی ہو جائے یعنی وہ کائنات میں تغیر و اصلاح سے بے پروا ہوکر 'موجود' سے سمجھوتہ کرلے تو اُسے مردہ تصور کرنا چاہیے، کیوں کہ اپنی خودی سے آگہ ہونے کے بعد انا کے لیے عالم اپنی موجودہ صورت میں کسی طرح قابلِ قبول نہیں رہتا۔

بعض صوفیہ کے برعکس اقبال کا خیال یہ ہے کہ انائے کبیر میں انضمام انائے بشری کے درجات کی انتہا نہیں بلکہ "وہ (انائے بشری) اس سے اس طرح فیض یاب ہوتا ہے کہ انائے کبیر کی تخلیقی فعلیت کمال جوش و خروش سے اِس میں جاری وساری ہوجاتی ہے۔" (ص ۲۱۸) مزید یہ کہ فریضۂ تخلیق کی ادائی کے لیے موزوں ترین انا وہ ہے جو انائے کبیر سے نزدیک تر ہے۔

انائے بشری کے مقاصد سے بحث کرتے ہوئے فاضل مصنف، قرآن کریم کے حوالے سے نیابتِ الٰہی کو اس کا اہم ترین مقصد قرار دیتے ہیں۔ یہ مقصد اسے اپنے گرد و پیش سے نامطمئن رکھتا ہے۔ ماحول سے مسلسل پیکار پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ انقلابات اور تغیرات کے ہجوم میں کمالِ مطلق کا متلاشی رہتا ہے۔ اس تلاش میں عشق رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ عشق خوابیدہ صلاحیتوں کو عالمِ شہود میں لاتا ہے اور بالآخر اسے انائے کبیر سے قریب تر کردیتا ہے۔ اقبال نے ایسے انا کو مردِ مومن کے لقب سے یاد کیا ہے۔

اس کے بعد خواجہ عبدالحمید، اقبال کے مردِ مومن کی صفات بیان کرتے ہوئے اس کی صفتِ تخلیق پر خاص زور دیتے ہیں۔ بشری انا اِس درجے پر تخلیقِ خیر کی خصوصی استعداد حاصل کر لیتا ہے اور نیابتِ الٰہی کا حق دار بن جاتا ہے۔ بعد کے مباحث کا خلاصہ مضمون نگار کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:۱

"بشری انا ایک خاص مقصد کو لیے ہوئے دنیا میں آیا ہے اور یہ مقصد ہے انائے کبیر کی صحیح نیابت کر کے اُس سے قرب حاصل کرنا، جو انا اس مقصد میں کامیابی حاصل کرتا ہے اس کی تخلیقی قوتیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ وہ اپنے ماحول کے لیے منبعِ فیض بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین انا کو قرآن حکیم نے 'رحمۃ للعالمین' کا لقب دیا ہے"۔

۴۔ "معارف" جولائی ۱۹۴۵ء (جلد ۵۶، شمارہ ۱) میں 'اقبال، انا اور تخلیق' کے عنوان سے ایک اور مضمون شایع ہوا ہے۔ صاحبِ مضمون جناب اسد ملتانی پہلے تو اس امر پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ آج کل فلسفہ و کلامِ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، پھر اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ عام طور پر نہایت سطحی قسم کی تحریریں سامنے آ رہی ہیں۔ مقالہ نگار عموماً اپنے ذہن میں چند خیالات و نظریات مجتمع کر لیتے ہیں اور پھر کلامِ اقبال سے اپنے مطلب کے اشعار یکجا کر کے جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد فاضل مقالہ نگار 'زبورِ عجم' کی اس نظم

۱۔ "معارف" دسمبر ۱۹۴۴ء، جلد ۵۴، شمارہ ۶، ص ۲۵۰۔

کی طرف توجہ دلاتے ہیں: ایں جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است . . . ان کے خیال میں ناقدین و شارحین نے اس کے افہام میں غلطی کی ہے۔ اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ۱

"یہاں تک تو اقبال نے اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ یہ دونوں جہان ہمارے ادراک و تخیل کا نتیجہ ہیں۔ اب اس تمہید کے بعد خالقِ کون و مکاں کو مخاطب کرکے سوال کیا ہے کہ تیرا نشان کہاں ہے؟ جب یہ دونوں جہان ہمارے آثار ہیں تو تیرا جہان کون سا ہے؟ سوال نہایت نازک ہے، کیوں کہ واقعی جو کائنات ہمارے ہی خیال کا بت خانہ ہو اس کے مطالعے سے تو ہمیں خود اپنی ذات کا پتا چلے گا۔ ایسی محدود کائنات میں خدا کا نشان کیوں کر مل سکتا ہے۔ لیکن شاعر نے بکمالِ حکمت اسی سوال میں 'اے من از تو پائندہ' کا ٹکڑا رکھ کر انسان اور خدا کے تعلق کی طرف بلیغ اشارہ کردیا ہے"۔

۵- "معارف" ستمبر ۱۹۴۵ء (جلد ۵۶، شمارہ ۳) میں بشیر مخفی قادری کا ایک مضمون بعنوان "اقبال کے تصورِ خودی کا ماٰخذ" شایع ہوا ہے۔ مضمون کے آغاز میں ادارۂ "معارف" کی طرف سے ایک مختصر وضاحتی اور اختلافی نوٹ بھی موجود ہے، جس سے مضمون کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مذکورہ عبارت درج ذیل ہے۔ ۲

۱- "معارف" جولائی ۱۹۴۵ء، جلد ۵۶، شمارہ ۱، ص ۴۰۔

۲- "معارف" ستمبر ۱۹۴۵ء، جلد ۵۶، شمارہ ۳، ص ۱۷۱۔

"اِس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کا تصورِ خودی اور ان کے بعض دوسرے افکار و مصطلحات سید گل حسن شاہ صاحب قادری پانی پتی رحہ کے کلام اور ان کی صوفیانہ تصانیف سے ماخوذ ہیں اور خودی کے اِس تصور کے پہلے مبلغ شاہ صاحب تھے۔

درحقیقت دنیا میں بہت کم افکار و تصورات ایسے ہیں جنھیں بالکل نیا اور اچھوتا کہا جا سکے۔ اِس لیے تنہا کسی فکر کا دھندلا اور ابتدائی تصور پیدا ہونا ، ایجاد کی نسبت کے لیے کافی نہیں ہے۔ موجد وہی کہلائے گا جس نے سب سے پہلے مدلل اور مرتب طریقے سے بحیثیت، فن فلسفہ یا تعلیم کے اس کو پیش کیا"۔۱

صاحبِ مضمون نے اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل دیے ہیں وہ ناکافی اور بے بنیاد ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ سید گل حسن شاہ قادری کی کتاب جس پر مذکورہ مضمون کی اساس ہے ۱۹۱۹ء میں شایع ہوئی اور اقبال نے خودی کا تصور 'اسرارِ خودی' میں پیش کیا جو ۱۹۱۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔

اِس ضمن میں فاضل مصنف کا یہ قیاس بھی قابلِ غور ہے کہ شاید اقبال نے مولانا اسماعیل میرٹھی کے توسط سے شاہ صاحب تک

۱۔ گل حسن شاہ صاحب ، مولانا سید غوث علی شاہ کے مرید اور اسماعیل میرٹھی کے پیر بھائی تھے۔ (بحوالہ "حیات و کلیاتِ اسماعیل" طبع اول ، دھلی، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ، ۱۹۳۹ء ، ص ۴۱)۔

رسائی حاصل کی ہو، جن کے اسماعیل میرٹھی سے خاص مراسم تھے۔ لیکن انھوں نے اسماعیل میرٹھی (۱۹۱۷ء — ۱۸۴۴ء) اور علامہ اقبال کے تعلقات کی نشان دھی نہیں کی۔

۶۔ فلسفۂ اقبال کی تشریح و توضیح کے ضمن میں ایک لایق مطالعہ مضمون، فروری ۱۹۴۶ء (جلد ۵۷، شمارہ ۲) میں موجود ہے۔ "فلسفۂ اقبال کا مرکزی خیال، وحدت و حرکت" کے عنوان سے شایع شدہ یہ مضمون جناب شوکت سبزواری کا نتیجۂ فکر ہے۔ یہ مقالہ "معارف" کے ذخیرۂ اقبالیات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

مقالے کی ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ اقبال حقیقتِ کبریٰ کے تصور پر یقین رکھتے ہیں اور اسے حیاتِ برتر کا نام دیتے ہیں۔ یہ حیاتِ برتر یا حقیقتِ روحانی، کائناتِ محسوس میں مجسم ہوتی ہے اور ایک مقناطیسی قوت کی طرح اشیا کی رگوں میں دوڑتی رہتی ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار عمل کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں، عملِ محض اور عملِ ظاہر۔ عملِ محض روح یا نفس کا متبادل ہے اور عملِ ظاہر جسم کا قائم مقام۔ روح اور جسم کے فرق یا مماثلت کو آن اور نقطے کی مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ نقطہ آن کا کثیف تصور ہے۔ اِس معمولی یا اعتباری فرق کی بنیاد پر آن سے آنات کا سلسلہ یا زمان وجود میں آتا ہے اور نقطہ، حرکت کے سبب مکان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال کی نگاہ میں آن کو نقطے پر فوقیت ہے۔ جدید طبیعات کا رجحان مادی وحدت کی طرف ہے اور آئن اسٹائن نے بھی زمان کو مکان کا چوتھا بُعد (Fourth Dimension) قرار دے کر اس کی حیثیت ثانوی

رکھی ہے۔ مگر اقبال کا رجحان روحی یا غیر مادی وحدت کی طرف ہے اور وہ زمان کی برتری پر زور دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں حرکت زمان سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ دونوں کی حقیقت تغیر ہے اور یہی زمان یا حرکت، مکان کے وجود کا باعث ہے۔ صاحبِ مضمون لکھتے ہیں۔۱

"کائنات حقیقتِ کبریٰ کے بے پایاں اعمال سے ہے یا خود بے پایاں اعمال ہی ہیں جنھیں کائنات کہا گیا ہے۔ یہ اعمال منفرد اناؤں کی صورت میں جلوہ فرماتے ہیں۔ ہر انا ایک آن ہے اور ہر آن خدائے برتر و توانا کی ایک شان ہے۔"

بحث سمیٹتے ہوئے صاحبِ مضمون اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال فلسفۂ ہمہ اوست کے برخلاف، کائنات کو عین خدا تسلیم کرنے کے بجائے اُسے خدا کا فعل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کا ہر عمل و ارادہ ایک انا ہے اور اناؤں کے اِس طویل سلسلے میں سب سے طاقت ور اور ترقی یافتہ انا انسان ہے۔ بے شمار اناؤں کا مجموعہ یہ کائنات ہے۔

۷۔ "معارف" اپریل تا نومبر ۱۹۴۷ء (جلد ۵۹—۶۰) میں مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک معرکہ آرا مقالہ قسط وار شایع ہوا ہے۔ مقالے کا عنوان ہے "اقبال کا فلسفۂ خودی" آٹھ قسطوں پر مشتمل یہ علمی مضمون بعد ازاں ان کی معروف کتاب "اقبال کامل" کا حصہ بنا۔ کتاب کی اشاعت کے وقت اس مقالے کے بعض حصوں میں معمولی ترمیمات کی گئیں اور کچھ عبارتیں کلیۃً حذف کردی گئیں، لیکن

۱۔ "معارف" فروری ۱۹۴۶ء، جلد ۵۷، شمارہ ۲، ص ۱۴۲۔

اس ترمیم و تخفیف سے مقالے کی حیثیت و افادیت متاثر نہیں ہوئی۔

پہلی قسط کے آغاز میں آٹھ صفحات پر مشتمل تمہیدی عبارت ہے، جسے "اقبال کامل" میں دو صفحات میں سمودیا گیا ہے۔ مذکورہ تمہید میں "نیرنگِ خیال، اقبال نمبر" کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا گیا ہے۔ اِس خاص نمبر میں اقبال کے فلسفۂ خودی کی تشریح کرتے ہوئے اُسے جبر و قہر، قوت و شوکت اور کسی حد تک حیوانیت کے مماثل و مرادف ظاہر کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اِسے 'غلط اور خطرناک تشریح' قرار دیا ہے۔

مولانا اپنے مقالے کا آغاز اِس نکتے سے کرتے ہیں کہ اخلاقی فضائل کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایجابی یعنی دلیری، آزادی، حق گوئی اور بلند ہمتی وغیرہ۔ (۲) سلبی اخلاق یعنی توکل و قناعت، تواضع و خاکساری اور عفو و درگذر وغیرہ۔ ہمارے صوفیہ نے زیادہ تر سلبی اخلاق پر زور دیا ہے؛ جب کہ اسلام نے اپنی جامعیت کے سبب ایجابی، سلبی، انفرادی اور اجتماعی ہر قسم کے اخلاق کی تعلیم دی ہے۔ اقبال کے نزدیک اِسلامی نظامِ اخلاق صرف اُسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب فرد کو اپنی خودی کا احساس و ادراک ہو جائے۔

بعد ازاں اثباتِ خودی کے لیے انھوں نے اپنے دلائل کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے اور انھیں مقدماتِ خودی کا نام دیا ہے۔ مذکورہ مقدمات یہ ہیں: ۱- خودی ۲- شرفِ انسانیت ۳- تسخیرِ فطرت ۴- مسئلہ خیر و شر ۵- روح و جسم کا اتحاد ۶- مسئلہ جبر و اختیار ۷- تخلیقِ مقاصد ۸- صحرائیت و بدویت ۹- عقل و عشق ۱۰- مسئلہ ارتقاء۔

مقدمۂ اول کے خاص نکات درج ذیل ہیں۔

● — ہر شے کے وجود پر شک کیا جا سکتا ہے لیکن ہا ایں ہمہ جو شے تمام چیزوں پر شک کرتی ہے، اس کا وجود یقینی ہے۔

● — خدا ہی خودی کا خالق ہے۔

● — انسانی خودی، ذاتِ خداوندی سے جدا اپنا ایک وجود رکھتی ہے۔

● — خودی کا استقلال یا خودی کی انفرادی حیثیت کی بقا ضروری ہے۔

اثباتِ خودی کا دوسرا مقدمہ شرفِ انسانیت ہے۔

● — صوفیہ کے نزدیک شرفِ انسانی کا سبب نفسِ انسانی نہیں بلکہ پرتوِ خدا ہونا ہے۔ اقبال کی نگاہ میں انسانیت ہی انسان کے لیے باعث شرف ہے۔

● — انسان خدا کا مقصد اصلی ہے۔

● — انسان تمام کائنات پر فضیلت رکھتا ہے۔

تیسرے مقدمے کی خاص خاص باتیں یہ ہیں۔

● — انسان میں ایک قوت جاذبہ موجود ہے، جو سارے عالم کو اپنے اندر جذب کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ اس جاذبیت کا نام تسخیرِ فطرت ہے۔

● — تسخیرِ فطرت کی ایک صورت یہ ہے کہ خدا نے کائنات کی بڑی بڑی قوتوں کو خود انسان کے لیے مسخر کردیا ہے۔ اس میں انسان کی سعی و جہد کا کوئی دخل نہیں۔

● — دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اپنی جسمانی قوت سے فطرت کو تسخیر کرتا ہے۔

● — تیسری صورت میں انسان عقل کے ذریعے بعض قوتوں پر قابو پالیتا ہے۔

● — چوتھی صورت روحانیت کی ہے۔

اثبات خودی کا چوتھا مقدمہ مسئلہ خیر و شر ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبدالسلام ندوی کی توضیحات کا اجمال ذیل میں دیا جاتا ہے۔

● — اس مسئلے کی تفہیم میں حکمائے اسلام نے کوئی متحدہ مؤقف اختیار نہیں کیا۔ بعض کے نزدیک خیر ایجابی اور شر سلبی شے ہے اور بعض کے خیال میں شر ایجابی اور خیر سلبی چیز ہے۔

● — شوپنہار کے خیال میں صرف دکھ، مصیبت اور حاجت ہی موجود بالذات ہیں۔

● — امام رازی اور زکریا رازی کے نزدیک اس عالم میں عام طور پر یا تو رنج و الم ہے یا رنج و الم کا ازالہ۔

● — اس دنیا میں کوئی لذت نہیں بلکہ جس شے کو لذت خیال کیا جاتا ہے، وہ محض رنج و الم سے بچنے کی ایک صورت ہے۔

● — قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے 'ہم نے انسان کو تکلیف میں پیدا کیا'۔

● — تخلیقِ انسانی کا مقصد لذت نہیں بلکہ انسانی شخصیت کا تحقق اور کمال ہے، جو کائنات کے ساتھ توافق پیدا کرنے کی وجہ سے حاصل ہو سکتا ہے"۔

● — رنج و تعب، درد و حرماں، حزن و ابتلا، آزمائش و بلا، یہ سب محرکات ہیں، جو صبر اور ہمت کو آزماتے ہیں اور انسانی شخصیت کی تعمیر میں معاون بنتے ہیں۔

● — یہ عالم خیر و شر کی رزم گاہ ہے اور اقبال کے نزدیک یہی زندگی ہے۔

● — اِس غیر مختتم معرکۂ خیر و شر میں معیارِ حق صرف اور صرف خودی ہے۔

روح و جسم کا اتحاد اثباتِ خودی کا پانچواں مقدمہ ہے۔ اس ضمن میں فاضل مصنف کے اہم دلائل درج کیے جاتے ہیں:

● — اقبال زندگی کے لیے جسمانی اور روحانی، دونوں قوتوں کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

● — جسم کی قوت سے روح توانائی حاصل کرتی ہے۔

● — اقبال روح و جسم کو ایک ہی حقیقت گردانتے ہیں۔

تاہم انھوں نے چند مقامات پر اس کے برخلاف رائے بھی ظاہر کی ہے۔[۱]

۱۔ "معارف" جون ۱۹۴۷ء (جلد ۵۹، شمارہ ۶) میں 'بابِ استفسار و جواب' کے تحت محمد اسلم سلیم کا ایک سوال بہ عنوان 'ڈاکٹر اقبال اور روح و جسم کا اتحاد' شایع ہوا ہے۔ اِس سوال کا تعلق مولانا عبدالسلام ندوی کے زیر نظر مقالے کے پانچویں مقدمے سے ہے۔ سائل رقم طراز ہے:

"مولانا موصوف اثباتِ خودی کے پانچویں مقدمے میں بیان فرماتے ہیں کہ 'اقبال مرحوم کا اصل میلان روح و جسم کے اتحاد کی جانب تھا، اگرچہ بعض موقعوں پر اس کے خلاف بھی رائے ظاہر کی ہے' مگر جہاں تک مجھے پتا چلتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مرحوم

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۵ پر دیکھیں)

چھٹا مقدمہ 'جبر و اختیار' ہے۔ صاحبِ مقالہ نے اِسے دوسرے مقدمات سے اہم قرار دیا ہے، کیوں کہ خودی کی نشو و نما میں قدرت و اختیار کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ دیگر نکات یہ ہیں:

● — انسان کو دو نسبتیں حاصل ہیں۔ ایک نسبت خدا کے ساتھ ہے، اور اس حیثیت میں وہ مجبور محض ہے۔ جب کہ دوسری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۴ سے)

کا اصلی میلان روح و جسم کے تغایر کی جانب تھا۔ کیوں کہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے"

مولانا نے اپنے مضمون میں 'مثنوی گلشن راز جدید' کے اس شعر سے استدلال کیا تھا:

تن و جاں را دو تا گفتن حرام است
تن و جاں را دو تا گفتن کلام است

سائل نے اسے اقبال کا اصلی میلان تسلیم کرنے کے بجائے متقدمین کے خیالات کا دھراؤ قرار دیا ہے۔

اِس سوال کا جواب مولانا عبدالسلام ندوی ہی کے قلم سے ہے۔ انھوں نے اپنا سابقہ مؤقف دھرایا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں فی نفسہ اِس مسئلے میں صحیح و غلط سے غرض نہیں، ہمارا موضوع تو بس اتنا ہے کہ اقبال کا خیال کیا تھا۔ اور وہ یقیناً یہی ہے کہ روح اور جسم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس کے برعکس بعض مقامات پر اقبال کا جو مؤقف نظر آتا ہے، درحقیقت وہی متقدمین کے نظریات کا دھراؤ ہے۔

نسبت کائنات کے ساتھ ہے ، اور اس لحاظ سے انسان آزاد و خود مختار دکھائی دیتا ہے۔

● — انسان کی قدرت اور ایجاد و اختراع بے حد ہے۔ علامہ نے انسان کے فعلِ تخلیق میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ اسے خدا کا شریک بنا دیا ہے مگر یہ سراسر شاعرانہ طرزِ استدلال ہے۔

● - فلسفیانہ حیثیت سے اقبال نے جبر و اختیار میں توازن کا نظریہ اپنایا ہے۔

'تخلیقِ مقاصد' اثباتِ خودی کا ساتواں مقدمہ ہے۔ اس کی توضیح میں پیش کردہ دلائل کا خلاصہ یہ ہے۔

● — ترکِ دنیا کے معلموں کی نگاہ میں نجات کا واحد ذریعہ، خواہشاتِ نفسانی کا خاتمہ ہے۔

● — خواہشوں کی ایک قسم زندگی کے لیے باعثِ تخریب ہے اور ایک قسم باعثِ تعمیر ہے ؛ جس سے نفس کی تہذیب اور خودی کی نشو و نما ہوتی ہے۔

● — بلند مقاصد ، حقیر خواہشوں کو فنا کر کے انسان کو بے نیازی اور استغنا کی دولت سے مالامال کرتے ہیں۔

آٹھویں مقدمے 'صحرائیت اور بدویت' میں مقالہ نگار نے ثابت کیا ہے کہ اقبال کے یہاں اِس سے مراد وحشت و بربریت نہیں ہے ، بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ تمدن و تہذیب کے مضر اثرات سے خود کو محفوظ و مامون رکھا جائے۔ اِس مقدمے میں تہذیب اور انسانی زندگی سے متعلق ابنِ خلدون کے خیالات کا خلاصہ بھی شامل ہے ، جسے بعد میں " اقبالِ کامل" کی اشاعت کے وقت حذف کر دیا گیا۔

'عقل و عشق' اثباتِ خودی کا نواں مقدمہ ہے۔ اِس کے خاص نکات درج ذیل ہیں:

● — اِشراقیوں کے نزدیک نظامِ عالم قہر و مہر کی بنیاد پر قائم ہے۔ ہر بلند نور کو نیچے کے نور پر غلبہ حاصل ہے اور نیچے کا نور بلند نور سے محبت رکھتا ہے۔

● — عشق نام ہے معشوق کے ساتھ متحد ہونے کا اور اتحاد صرف روحانی امور کا خاصہ ہے کیوں کہ جسمانی چیزوں میں اتحاد نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ صرف ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہیں۔

● — دنیا میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے اور ہر معلول اپنی علت سے عشق و محبت رکھتا ہے۔

● — خدا چوں کہ ہم تن روح ہے، اس لیے اس سے اتحاد کے لیے جسم کو فنا کرنا ضروری ہے۔

● — چھٹی صدی ہجری تک عشق کے یہی اشراقی نظریات مقبول رہے، لیکن بعد ازاں تصوف اور فلسفے کی راہیں جدا ہو گئیں اور عشق و عقل ایک دوسرے کے حریف قرار پائے۔

● — مولانا روم نے امام رازی کی عقل و حکمت کے مقابلے میں عشق و محبت کی آواز بلند کی اور بتایا کہ فلسفیانہ اور متکلمانہ عقل خدا تک نہیں پہنچا سکتی۔

● — عشق اور عقل کی حریفانہ کشمکش سے مولانا روم اور اقبال دونوں نے اپنے دور میں کام لیا۔

● — اقبال نے جس عشق کو عقل کا مقابل ٹھہرایا ہے وہ رندانہ عشق نہیں بلکہ جنونِ فرزانہ ہے۔

● — اقبال کی نگاہ میں عشق باعثِ رسوائی نہیں، بجائے خود ایک عز و شرف ہے۔

● — عشقِ زیرک ایک عملی اور تخلیقی قوت ہے۔

اثباتِ خودی کا آخری مقدمہ یعنی ' مسئلۂ ارتقاء ' درج ذیل حقائق پر مبنی ہے۔

● — عجمی تصوف عملی زندگی میں تمام تر عدم تحریک کے باوجود اخلاقی اور روحانی زندگی میں مسلسل ارتقاء کا داعی ہے۔

● — انسانِ کامل صرف روحانی ارتقاء سے جنم لے سکتا ہے۔

● — انسانِ کامل عقل ، عشق اور اخلاقِ حسنہ کا نمونہ ہوتا ہے۔

● — یہ کامل ترین انسان خودی کی ترقی کا آخری زینہ ہے اور اقبال اس مرحلے کو نیابتِ الٰہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

زیر نظر مقالے کے ساتویں حصے میں مولانا عبدالسلام ندوی نے فلسفۂ خودی کے ماٰخذ سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلے نکلسن کے نام اقبال کے خط کا ذکر کیا ہے جس میں علامہ نے مغربی نقادوں کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ ان کا ' انسانِ کامل ' اور نٹشے کا ' فوق البشر ' ایک ہی شے ہے۔ صاحبِ مضمون نے اقبال کے اس دعوے کا بھی ذکر کیا ہے کہ اسرارِ خودی کا بنیادی فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکماٰ کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ بعد ازاں انھوں نے چند ناقدینِ اقبال ، خصوصاً خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے اقبال اور نٹشے کی فکری مماثلتوں اور ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ لیا ہے۔

مقالے کا آخری حصہ اقبال اور مولانا روم کی فلسفیانہ قربتوں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے ان عظیم فلسفیوں کے افکار میں درج ذیل مماثلتیں موجود ہیں۔

● — دونوں وجدان کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں۔

● — دونوں خودی کی نفی کے برعکس اس کی تقویت کے داعی ہیں۔

● — تقدیر کے بارے میں دونوں کا تخیل عام تصور سے مختلف ہے۔

● — دونوں کی فکر اِس بنیاد پر قائم ہے کہ تمام موجودات ادنا سے اعلا منازل کی طرف گامزن ہیں۔

● — عروج آدم کی کوئی حد نہیں۔

● — قرآنِ کریم کا مطلوبہ انسان دونوں کے نزدیک انسانیت کی معراج کا مظہر ہے۔

● — دونوں کی نگاہ میں سعی و جہد زندگی ہے اور خفتگی موت۔

● — عشق ہی کے ذریعے عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان پائدار تعلق استوار ہو سکتا ہے۔

● — انسان، خدا کی ذات میں فنا ہونے کے بعد بھی اپنی خودی قائم رکھ سکتا ہے۔

اِس طویل جائزے کو منطقی انجام تک لے جاتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔۱

> "اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا یا انھوں نے دوسروں کی خوشہ چینی کرکے ان ہی کے فلسفے کو شاعرانہ آب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ان کے فلسفۂ خودی کے تمام اساسی مضامین درحقیقت

۱۔ "معارف" نومبر ۱۹۳۷ء، جلد ۶۰، شمارہ ۵، ص ۳۳۵۔

قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔ قرآن مجید میں فضیلتِ انسانی تسخیرِ فطرت ، عزم و استقلال ، جرأت و شجاعت ، فتح و نصرت ، حمیت و غیرت اور قدرت و اختیار پر بہ کثرت آیتیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تمام مضامین قرآن مجید ہی سے لیے، اس کے بعد انھوں نے فلسفہ و تصوف پر نگاہ ڈالی تو ان کو دو متضاد فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریے نظر آئے۔ ایک تو شوپنہار کا قنوطی فلسفہ تھا اور اس کے برخلاف نٹشے کا فلسفہ تھا۔ اسی طرح صوفیانہ تعلیمات بھی مختلف تھیں۔ تصوف کی عام کتابیں ، اکثر صوفیہ اور فارسی شاعری کا تمام‌تر ذخیرہ، اشراقی اور افلاطونی فلسفے سے متأثر تھا، جو زندگی کو ہیچ قرار دیتا تھا اور صرف سلبی اخلاق کی تعلیم دیتا تھا۔ لیکن مثنوی مولانا روم میں ان کو جابجا ایسے اشعار اور ایسے خیالات و نظریات ملے جو قرآن مجید کی تعلیمات کے موافق اور فلسفۂ خودی کے مؤید ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اِن تمام فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریات میں شوپنہار اور صوفیانہ تعلیمات اور فارسی شاعری کے تمام ذخیرے کو قرآن مجید کی تعلیمات کے مخالف پایا، اس لیے ان کو بالکل نظرانداز کردیا، اسی طرح نٹشے کے فلسفے میں ان کو خودی کے جو شیطانی عناصر نظر آئے ، ان کو تو انھوں نے بالکل چھوڑدیا ، البتہ اصل مسئلے کو لے کر اس شیطانی خودی کو یزدانی خودی بنادیا اور اس میں ان کو قرآن مجید کے بعد مولانا روم کی مثنوی سے مدد ملی"۔

۸- فلسفۂ اقبال کی تفہیم و تعبیر کے لیے "معارف" میں جو مقالات شایع ہوتے رہے ہیں اُن میں ڈاکٹر عشرت حسن انور کا سلسلۂ مضامین بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا گہرا فلسفیانہ مطالعہ اور تجزیے کی صلاحیت اُنھیں ناقدینِ اقبال میں نمایاں کرتی ہے۔ اُنھوں نے بڑی محنت اور دقتِ نظر سے اقبال کا موازنہ مغربی فلاسفہ سے کیا ہے اور فکرِ اقبال میں ارتقا کے مختلف مراحل بھی ترتیب وار بیان کیے ہیں۔ مذکورہ سلسلۂ مضامین کی تفصیل کچھ یوں ہے:

اقبال اور برگساں، "معارف" مئی، جون ۱۹۵۱ء، جلد ۶۷ -
اقبال اور نیطشے، "معارف" جولائی ۱۹۵۱ء، جلد ۶۸ -
اقبال اور جیمس وارڈ، "معارف" اگست، اکتوبر ۱۹۵۱ء، جلد ۶۸ -
اقبال اور ولیم جیمس، "معارف" نومبر ۱۹۵۱ء، جلد ۶۸-۱
اقبال اور وائٹ ہیڈ، "معارف" دسمبر ۱۹۵۱ء اور جنوری ۱۹۵۲ء، جلد ۶۸ اور ۶۹ -
اقبال رومی اور ولیم جیمس، "معارف" فروری ۱۹۵۴ء، جلد ۷۳ -
اقبال رومی اور برگساں، "معارف" مارچ ۱۹۵۴ء، جلد ۷۳ -
اقبال رومی اور شنکر، "معارف" جون، اگست، ستمبر ۱۹۵۴ء، جلد ۷۳ اور ۷۴ -

سلسلہ وار مقالات کے پہلے دو حصوں میں اقبال اور برگساں کے افکار کا تجزیہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اقبال، برگساں کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ برگساں کائنات کے بارے میں 'ایک مسلسل تغیر اور تحرک' کا فلسفہ رکھتا

۱- "معارف" میں جلد ۶۸ کے بجائے جلد ۶۹ کا اندراج سہوِ کتابت ہے۔

تھا، جو اقبال کے مزاج سے خاص طور پر ہم آہنگ تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ برگساں عرفانِ حقیقت کے لیے عقل کے بجائے وجدان کو واحد معتبر ذریعہ سمجھتا تھا۔ ان دونوں باتوں نے اقبال کی فکر کو متاثر کیا، مگر جب انھیں محسوس ہوا کہ برگساں کا فلسفہ اس 'خودی اور انانیت' کی تائید نہیں کرتا جس کا ادراک انھیں حاصل ہو رہا ہے، تو ان کی توجہ نیطشے کی طرف مبذول ہوئی۔

اقبال نیطشے کے درج ذیل خیالات کی تائید کرتے ہیں:

● — ہماری خودی اخلاقیات، الٰہیات اور ارضی و سماوی انکشافات میں ہر جگہ جلوہ افروز رہتی ہے۔ یعنی ہم اپنے نظریات کے خالق خود ہیں۔

● — خوب و ناخوب کی تعمیر خودی ہی کے ذریعے ہوئی ہے۔

● — خودی کا اظہار طاقت و جبروت میں ہوتا ہے۔

● — جو فعل خودی کی پرورش کرتا ہو وہ خوب ہے اور جو اس کے برعکس ہو وہ ناخوب۔

اقبال کے نزدیک نیطشے کے فلسفۂ خودی میں درج ذیل امور ناقابلِ قبول ہیں۔

● — نیطشے کا خیال تھا کہ 'فوق البشر' ہی حاکمیت کے لایق ہے اور وہی خیر و شر کا معیار بن سکتا ہے۔ گویا طاقت ور کی اطاعت کمزوروں پر واجب ہے۔

● — غلام کا اخلاق ہمیشہ غلامانہ اخلاق ہی کہلائے گا۔ ایسا اخلاق انسانی شخصیت اور خودی کے لیے انتہائی مضر ہے۔

● — خودی کا تقاضا ہے کہ 'غیر خود' کی طرف توجہ نہ دی جائے۔

● — نیطشے کے نزدیک خودی کے ارتقا اور فروغ کے لیے اقرار خدا ضروری نہیں۔

اقبال اس حد تک تو نیطشے کے مؤید ہیں کہ معاشرتی نظام اصلاح و ترقی کے لیے ایک ' پختہ تر ' انسان کا مرہونِ منت ہے ، لیکن اس ' مردِ کامل ' کی تعریف میں دونوں مفکرین کے درمیان شدید اختلاف موجود ہے۔ اقبال کا ' انسانِ کامل ' بندۂ مومن ہے ، جس کی زندگی سیرتِ محمدی صم کا نمونہ ہے اور جس کا دل تعلیمات قرآنی سے معمور ہے۔ جب کہ نیطشے کا ' فوق البشر ' اخلاقی قیود سے یکسر آزاد ہے۔ بلکہ ' غیر خود ' کا انکار اُسے معاشرتی بندھنوں سے بھی غافل کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور ، اقبال اور نیطشے کے بنیادی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۱

> " اقبال مذہب کی تردید میں کسی طرح بھی نیطشے کے ہم خیال نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے (اور شاید نیطشے خود اِس کا اعتراف کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے) کہ نیطشے کے تمام اعتراضات صرف اس مذہب کے خلاف صحیح ہیں جس کا نام عیسائیت ہے۔ دنیا میں ایک ایسا مذہب بھی آیا ہے جو نیطشے کے فلسفے کی تائید کرتا ہے اور خودی کی نفی کرنے کے بجائے اس کی تائید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے ؛ یہ مذہب اسلام ہے۔"

زیر نظر سلسلۂ مقالات کے اگلے حصے میں اقبال اور جیمس وارڈ کا موازنہ ملتا ہے۔ اس میں پہلے جیمس وارڈ کے نظریات قدرے تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور پھر اقبال کے فلسفے پر ان کے اثرات کا

۱۔ " معارف " جولائی ۱۹۵۱ء ؛ جلد ۶۸ ؛ شمارہ ۱ ؛ ص ۵۷۔

جائزہ لیا گیا ہے۔ وارڈ کے تصورات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

● — کثرتِ وجود کا اعتراف ہی صحیح فلسفے کی بنیاد بن سکتا ہے۔

● — ہر شے انفرادیت کا ذوق رکھتی ہے۔ جس قدر کوئی چیز انفرادیت حاصل کرتی چلی جاتی ہے، اسی قدر اس عالم میں اس کی حیثیت بڑھتی جاتی ہے۔ ارتقا کا مفہوم بھی یہی ہے کہ انفرادیت کے حصول کی کوشش جاری رکھی جائے۔

● — ارتقائی زینے کی انتہا انسان ہے۔

● — انفرادیت کے ساتھ شعورِ انفرادیت کا ہونا لازم نہیں، اولیٰ ہے۔ اس لیے انسان، حیوان اور دیگر نباتات و جمادات، سب منفرد اور بے مثل ہیں۔ مزید یہ کہ کائنات میں ہر طرف ذوقِ انفرادیت جاری و ساری ہے۔

اقبال اِن تصورات و خیالات سے متاثر ہوئے اور کافی حد تک ان سے اتفاق بھی کیا، مگر دونوں کے درمیان کامل مماثلت پیدا نہ ہوسکی۔ ذیل میں دونوں مفکرین کے اختلافی نکات درج کیے جاتے ہیں۔

● — جیمس وارڈ کے برخلاف اقبال کے خیال میں جذبۂ انفرادیت ازلی و ابدی ہے، اس کا کوئی نقطۂ آغاز نہیں۔ وجود کے راستے میں کوئی مقام اس قدر پست نہیں جسے انفرادیت سے تہی قرار دیا جاسکے۔

● — اقبال حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں یہ صورت حال رہبانیت میں تو قابلِ قبول ہوسکتی ہے لیکن کسی معاشرتی ڈھانچے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

● — اقبال کے نزدیک اسلام انفرادیت کا مؤید ضرور ہے لیکن اس کے لیے تخلقوا باخلاق اللہ کی شرط عاید کرتا ہے۔

مذکورہ مقالے کے دوسرے حصے (اکتوبر ۱۹۵۱ء) میں ڈاکٹر عشرت حسن انور، جیمس وارڈ کے حوالے سے چند اور فکری نکات بیان کرتے ہیں۔

● — کثرتِ افراد کو حقیقی تسلیم کرنے سے یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ پھر عالم میں انتشار اور بے نظمی کیوں نہیں؟ جیمس وارڈ کے خیال میں یہ توازن خود بہ خود پیدا ہوگیا ہے۔ وہ اس کے لیے باری تعالیٰ کے وجود کا اقرار ضروری خیال نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک اجزائے عالم کی ہم آہنگی ایسی ہی ہے جیسی افراد کے میل جول سے جنم لینے والی روایات، جن کی پاس داری ضروری سمجھی جاتی ہے۔

● — جیمس وارڈ وجود خدا کا منکر نہیں، مگر اس کے ذہن میں اس کے لیے دلائل ذرا مختلف انداز کے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر فرد اور ہر شے حصولِ انفرادیت میں مصروف ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوشش کس طرح شروع ہوئی؟ جواب کے طور پر ہمیں ایک قادرِ مطلق کی ذات کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

اقبال نے جیمس وارڈ کی فکر سے استفادے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے بھی کیے ہیں۔ خاص طور پر اس امر میں کہ انفرادیت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ اصطلاح جیمس وارڈ کے یہاں مبہم اور غیر واضح ہے مگر "اقبال نے انفرادیت کے معنی اس قدر مفصل بیان کیے ہیں اور اس کو اس قدر دہراتے رہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تمام فلسفہ انفرادیت کی تفسیر اور تعمیر تک محدود ہے"۔ (ص ۲۹۱)

مذکورہ مفکرین کے علاوہ مشہور امریکی فلسفی ولیم جیمس کے نظریات بھی اقبال کے لیے باعثِ کشش رہے ہیں، لیکن انھی کی طرح اِس کے نظریات و خیالات بھی علامہ کو محض ایک حد تک متاثر کر سکے۔ یوں ان کی متحرک فکر مسلسل ارتقا کی منازل طے کرتی رہی۔ قرآن اور سیرتِ رسول ص کے گہرے مطالعے نے انھیں جو بصیرت عطا کی تھی وہ افکارِ مغرب کے پیچ دار راستوں میں ان کی راہبر و راہنما رہی۔

ولیم جیمس کے اہم نظریات یہ ہیں۔

● — کثرتِ وجود کے اثبات سے فلسفۂ الٰہیات کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک صورت تو وہ ہے جس کے نتیجے میں ہمارے اور خدا کے درمیان غیریت باقی رہتی ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کثرتِ وجود کا اقرار کرنے کے باوجود خدا اور افرادِ عالم کے درمیان کسی قدر قربت قائم رہتی ہے۔

● — انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ حقیقت سے ممکن حد تک نزدیکی حاصل کرے۔

● — "جس طرح ہماری اپنی ذات میں مختلف شعوری کیفیات ایک دوسرے سے متعلق ہیں؛ اسی طرح ہم سب کی شعوری، نیم شعوری اور غیر شعوری کیفیات اور تجربات و احساسات، ذاتِ باری میں مربوط اور اسی سے منسلک ہیں۔" (ص ۳۵۶)

اقبال اور ولیم جیمس کی فکری مماثلتیں درج ذیل ہیں:

● — دونوں، خالق و مخلوق کے درمیان مہجوری ختم کرنا چاہتے ہیں۔

● — دونوں اس بات کے قائل ہیں کہ کثرت اور وحدت کی

گتھی ذاتِ نفس کے وجدان سے کھل سکتی ہے۔

● — یہ خیال بھی دونوں مفکرین کے درمیان مشترک ہے کہ کثرتِ وجود، خالق کے وجود سے مختلف نہیں، لیکن ذاتِ باری قریب ترین ہوکر بھی ہم سے جدا ہے۔

اقبال ولیم جیمس کے زیر اثر کثرتِ وجود اور ذاتِ باری میں قربت کے مؤید ہیں، لیکن اس طرح یہ تضاد رونما ہوتا ہے کہ کثرتِ وجود کے ساتھ وحدتِ وجود کا اقرار کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس مشکل کے حل میں وائٹ ہیڈ اقبال کی رہ نمائی کرتا ہے۔ اِس مغربی مفکر کی بنیادی فکر ڈاکٹر عشرت حسن انور کے الفاظ میں یہ ہے۔[۱]

> "وائٹ ہیڈ کے نزدیک تمام موجودات (یعنی جو کچھ نظر آتا ہے) ایک لامتناہی سلسلۂ تغیرات، حالات اور واقعات کا دوسرا نام ہے . . . کائنات کو ایک مخصوص سلسلۂ واقعات تصور کرنے کے بعد نہ روح اور مادے کا تضاد رہتا ہے اور نہ جوہر اور عرض کے جھگڑے ہی رونما ہو سکتے ہیں۔ اِس طرح مادے اور روح میں کوئی غیریت باقی نہیں رہ سکتی . . . یہ تعینات باری تعالیٰ نے مختص فرمائے اور اسی کی نظر انتخاب نے کسی مخصوص واقعے کو مخصوص واقعے کے طور پر تجویز فرما دیا ہے۔ اس طرح تمام افراد اور تمام اشیأ من حیث الکل باری تعالیٰ ہی کے حسنِ انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ موجودہ واقعاتِ عالم (یعنی جملہ کائنات)

۱۔ "معارف" جنوری ۱۹۵۲ء جلد ۶۹، شمارہ ۱، ص ۶۵۔

کے بجائے لاتعداد مختلف الوجود واقعات (یعنی تمام افراد اور اشیأ منصۂ شہود پر جلوہ نما ہوسکتے تھے مگر باری تعالیٰ نے 'جو کچھ ہے' (یعنی جملہ موجودات) اس کو حسنِ قبول عطا فرما کر منظرِ شہود پر جلوہ گر کیا ہے . . . باری تعالیٰ کا وجود تمام براہین و دلائل اور وجوہات کے ماورا ہے اور جہاں انسانی عقل و فکر کی پرواز ختم ہوجاتی ہے وہاں سے اس کی تخلیقات کا آغاز ہوتا ہے"۔

اقبال، وائٹ ہیڈ کے جن خیالات سے اتفاق رکھتے ہیں ان کا اجمال کچھ یوں ہے۔

● — کائنات ایک واحد اعضائی تنظیم (Organism) ہے۔

● — اگر ہمیں کائنات کا من حیث الکل وجدان حاصل ہوجائے تو مادیت کے اقرار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

● — اِقبال ، وائٹ ہیڈ کے سلسلۂ تغیرات سے بھی اتفاق رکھتے ہیں۔

اقبال نے وائٹ ہیڈ کے نظامِ فکر میں ترمیم و تنسیخ سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً وہ اس کے برعکس ، کائنات کو تسلسلِ واقعات سمجھنے کے باوجود ، خودی اور ذوقِ انفرادیت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ باری تعالیٰ کا تصور وائٹ ہیڈ کے نزدیک "ایک پریشان کن، نہ سمجھ میں آنے والا اور ایسا لازمی مفروضہ ہے جو انسانی عقل و فکر کے لیے پیہم دردِ سر کا باعث ہے"۔ (ص ۲۰) مگر اقبال کی نگاہ میں ذاتِ خداوندی لاینحل مفروضہ نہیں بلکہ ایک لازمی حقیقت ہے۔

اس سلسلے کے آخری تین مضامین میں مولانا روم کا موازنہ ولیم جیمس، برگساں اور شنکر اچاریہ سے کیا گیا ھے۔ ستمبر ۱۹۵۴ء (جلد ۴۷، شمارہ ۳) میں شایع شدہ قسط کے اختتام پر مصنف نے اس ارادے کا اظہار کیا ھے کہ اگلے شمارے میں اس طویل بحث کا خاتمہ اقبال اور رومی کے موازنے پر ھوگا، لیکن نہ جانے کیوں یہ مضمون شایع نہ ھو سکا۔ اور یہ مفید سلسلۂ مضامین تشنۂ تکمیل ھی رھا۔

۹۔ 'علامہ اقبال اور مسئلہ زمان' کے عنوان سے "معارف" جون، جولائی ۱۹۶۲ء (جلد ۸۹، شمارہ ۶ اور جلد ۹۰، شمارہ ۱) میں شبیر احمد خاں غوری کا ایک مقالہ شایع ھو چکا ھے۔ مضمون کے آغاز میں ادارے کی طرف سے ایک مختصر نوٹ ھے، جس میں بتایا گیا ھے کہ اس موضوع پر فاضل مقالہ نگار کا ایک اور مضمون "معارف" میں نکل چکا ھے، لیکن وہ نسبتہً مختصر تحریر تھی۔[۱]

مضمون نگار نے نہایت دقت نظر سے اقبال کے نظریۂ زمان کا جائزہ لیا ھے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ھے کہ "زمانے کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے واقف ھونے کی مخلصانہ کوشش کے باوجود علامہ اپنی

۱۔ جس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ھے وہ "معارف" اگست ۱۹۶۱ء (جلد ۸۸، شمارہ ۲) میں اشاعت پذیر ھوا اور اس کا عنوان تھا 'اقبال اور اسلام کے تصورِ زماں کی ترجمانی'۔ "معارف" جنوری ۱۹۶۵ء (جلد ۹۵، شمارہ ۱) میں بھی شبیر احمد خاں غوری کا ایک مقالہ بہ عنوان 'اقبال کا تصورِ زماں' شایع ھوا ھے، مگر یہ دونوں مضامین بالفعل ھم دست نہ ھونے کے سبب ھمارے جائزے میں شامل نہیں۔

اس خواهش میں ناکام ہی رہے۔" (جلد ۹۰ ص ۵۲)

صاحبِ مضمون نے جناب نیاز فتح پوری کے ایک مقالے "اقبال کا فلسفۂ خودی" کو بنیاد بنا کر گفتگو کا آغاز کیا ہے اور ان کے پیش کردہ درج ذیل امور سے اختلاف کا اظہار کیا ہے:

- مسئلۂ زمان نہایت اہم ہے۔
- وقت تمام صفاتِ وجود سے عاری ہے۔
- اقبال کے سامنے زمانے سے متعلق بہت پیچیدہ سوالات تھے۔
- اقبال مسئلۂ زمان کو انسان کی حیات و موت کا مسئلہ سمجھتے تھے۔
- اقبال کے نزدیک زمانے کا تعلق ارتقا سے تھا۔
- 'نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ' عینیت وجود اور وجوب خلق کا صوفیانہ انداز تعبیر ہے۔
- خدا کو عین زمانہ قرار دینا بیداری شعور کی آخری حد ہے۔

جناب شبیر احمد غوری نے درج بالا نکات میں سے اکثر کی تردید کی ہے۔ ان کے دلائل اور نظریات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

- مسئلۂ زمان کے سلسلے میں اقبال کے خیالات کی دو قسمیں ہیں (۱) شاعرانہ خیالات (۲) سنجیدہ علمی افکار۔
- اِس مسئلے سے متعلق ان کے اشعار میں شدید تناقص پایا جاتا ہے۔
- اقبال کے نزدیک تقدیر زمانے ہی کی ایک شکل ہے، جب کہ اس کے امکانات کے ظہور سے قبل اس پر نگاہ ڈالی جائے۔
- ان کے خیال میں یہ زمانے کا بالکل نیا تصور ہے۔

● — لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ کا مذکورہ نظریہ مشہور جرمن مفکر اسپنگلر (Spengler) سے ماخوذ ہے، اور اس کے یہاں قدیم ایرانی مذہب زروانیت سے آیا ہے۔

● — قرآن زمانے کے حقیقی ہونے (یعنی وجودِ خارجی) کی قطعاً تعلیم نہیں دیتا۔

● — زمانے کے بارے میں وجودِ حقیقی کا عقیدہ اور اس کے عین تقدیر ہونے کا تصور بے عملی کو جنم دیتا ہے۔ ایران کی قدیم تاریخ اس کی شاہد ہے۔

● — معدوم محض کو اہم قرار دینا سراسر توہم پرستی ہے۔

● — معاشرتی زندگی کی عملی ضرورتوں کے لیے زمانے کا حوالہ ضروری ہے۔ اسی لیے اشاعرہ نے اسے ایک پیمانہ قرار دیا اور بس۔

● — اگر زمانے کی افادی حیثیت کے احساس اور اس سے معاشرتی زندگی میں استفادے سے کسی تہذیب کی برتری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو یقیناً اسلامی ثقافت کا درجہ دوسری ثقافتوں سے بلند تر ہے۔ اسلام اصولی طور پر وقت کی افادی حیثیت کی قدر سکھاتا ہے۔

فاضل مقالہ نگار کی بحث کا حاصل انھی کے الفاظ میں، یہ ہے کہ :

> "علامہ سے اسلامی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں تسامح ہوا ہے۔ زمانہ (یا زمان و مکان) کا مسئلہ اسلامی فکر میں صرف اتنی حیثیت رکھتا ہے کہ غیر اسلامی فکر کے نمائندے ان اصنامِ خیالی کے آبگینے تراشتے

۱۔ "معارف" جولائی ۱۹۵۴ء، جلد ۹۰، شمارہ ۱، ص ۵۵۔

رہیں اور توحید کے دیوانے اِس کارگہ شیشہ گری کو پاش پاش کرتے رہیں — غرض اسلامی فکر کی تیرہ سو سال کی تاریخ شاھد ھے کہ اِسلامی تہذیب میں زمان و مکان کے مسئلے کو کوئی اھمیت نہیں دی گئی، زندگی اور موت کا سوال بنانے کا تو مذکور ھی کیا۔"

اِس مضمون سے اندازہ کیا جاسکتا ھے کہ "معارف" کے پیشِ نظر فکرِ اقبال کی جا و بےجا تائید کا مقصد ھرگز نہیں، بلکہ اس کا مقصود صرف اس قدر ھے کہ اِسلامی اصولوں کی روشنی میں افکارِ اقبال کا جائزہ لے کر اُن کے دینی تشخص کو اجاگر کیا جائے، اور 'خس و خاشاک سے پاک' اقبالیات کی ایسی تشکیل کی جائے جو خود اقبال کی اُمنگوں سے مطابقت رکھتی ھو۔

"معارف" کے اھلِ قلم نے فکرِ اقبال کے ایک اھم گوشے، سیاست و ریاست پر بھی اظہارِ خیال کیا ھے۔ اِس ضمن میں مولوی محمد عبدالسلام رام پوری اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضامین پیشِ نظر ھیں۔

۱۰— "معارف" کی جلد ۵۷ کے دو مسلسل شماروں مارچ، اپریل ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک اھم مضمون شاملِ اشاعت ھے۔ ۱ 'اقبال اور سیاسیات' کے عنوان سے شایع ھونے والے اِس مقالے میں اقبال کے فلسفۂ سیاسیات پر مفصل بحث ملتی ھے۔

۱— یہ مضمون پہلے "ھمایوں" لاھور، مئی ۱۹۳۲ء میں شائع ھوا بعد ازاں "معارف" کے لیے چند اضافوں اور حواشی کے ساتھ دوبارہ لکھا گیا۔ (بحوالہ: اقبالیات کے نقوش، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، طبع اول، لاھور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۷ء۔)

جب بھی اقبال کے سیاسی نظریات کا ذکر آتا ہے، معترضین کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا اقبال کا کوئی مستقل سیاسی نظریہ تھا بھی؟ اِس اعتراض کی تائید میں بعض تضادات کی نشان دھی کی جاتی ہے جو درحقیقت تضادات نہیں فکرِ اقبال کے ارتقائی مدراج ہیں۔ اِسی امر کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ لکھتے ہیں۔ ۱

> "سچ تو یہ ہے کہ تہذیبِ فرنگ کی تابانی کے سامنے بڑے بڑے خودی آشنا بھی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ علامہ اقبال بھی چندے اس کے دام میں گرفتار رہے مگر علومِ مشرق کے گہرے مطالعے، اِسلام اور مشرقی تمدن کی روح کے صحیح ادراک، یورپ کے سفر اور تمدنِ مغرب کے تجزیے نے اُن کو بہت جلد اس کی تابانی سے بدظن کردیا۔"

اقبال کے نظریۂ سیاست پر تضاد اور تناقص کی طعنہ زنی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کے خیالات مغربی مفکرین ولیم بلیک، نطشے اور برگساں وغیرہ کی خوشہ چینی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اس اعتراض میں دراصل جزوی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے، کیوں کہ بات اِس حد تک تو معقول اور درست ہے کہ اقبال نے بعض مغربی مفکرین کے خیالات سے استفادہ کیا ہے، لیکن اِسے تقلیدِ محض قرار دینا ناواقفیت کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ نے زیرِ نظر مضمون میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُنھیں نکات وار یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ "معارف" مارچ ۱۹۴۶ء، جلد ۵۷، شمارہ ۳، ص ۱۹۵۔

● — اقبال ایک عادل اور مؤثر حکومت کے لیے ایمان اور عشق کو ضروری سمجھتے ہیں۔

● — وہ دستورِ سلطنت کے لیے عقل کے بجائے وحی کو اساس قرار دیتے ہیں، کیوں کہ انسانی عقل کے وضع کردہ نظام خود غرضی سے خالی نہیں ہوسکتے۔

● — مذہب و ریاست کی مثال جسم و روح کی ہے۔

● — ان کے نزدیک مغربی جمہوریت، استبداد، تسلط اور غلبۂ عام کی ایک نئی شکل ہے۔

● — وہ اسلام کے تصورِ امارت کو پسند کرتے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضہ اور حضرت عمر فاروق رضہ کے دورِ حکومت کو مثالی قرار دیتے ہیں۔

● — اقبال کے مغربی نقادوں کے نزدیک پیامِ اقبال کا مفہوم جارحانہ طور پر سیاسی ہے، جب کہ خود اقبال اپنی شاعری کے اخلاقی مفاہیم پر زور دیتے ہیں۔

● — اقبال مغربی تہذیب کی روح سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور اسلامی نظامِ فکر کو اس کا حتمی علاج سمجھتے ہیں۔

● — وہ ایک ایسے معاشرے کا قیام چاہتے ہیں، جس میں انصاف، اخوت اور یک جہتی کا دور دورہ ہو۔ جو مادیت اور عقلیت کی خرابیوں سے پاک ہو۔ اور ایسا معاشرہ صرف اور صرف اسلام کے اصولوں پر قائم کیا جا سکتا ہے۔

● — اقبال قومیت کا ایسا تصور قبول کرنے پر آمادہ نہیں جس کی اساس، رنگ، نسل، وطن یا زبان ہو۔

● — اقبال سوشلزم کو وسیع انسانی برادری کی تعمیر اور

ترکیب کے لیے اتنا مضر نہیں سمجھتے، جتنا نیشنلزم کو۔ مگر سوشلزم کو بھی روحانیت کے بغیر ناقص خیال کرتے ہیں۔

۱۲- "معارف" اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء (جلد ۷۲، شمارہ ۴-۵) میں مولوی محمد عبدالسلام رام پوری کا ایک قابلِ توجہ مقالہ 'اقبال کی ریاست' شایع ہوا ہے۔ اشاعت سے پہلے یہ مضمون جنوری ۱۹۵۲ء میں رضا کالج رام پور میں پڑھا گیا۔ پہلے حصے میں اقبال کے سیاسی تصورات کا تاریخی تسلسل بیان کیا گیا ہے، جس میں روسو، ہیگل، کانٹ اور نطشے کے حوالے سے اقبال کے نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اقبال کے تصور ریاست کی مزید تشریح کی گئی ہے۔ اس مقالے کے خاص خاص نکات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

● — اقبال کی نگاہ میں اسلامی ریاست، سب سے بڑا اور طاقت ور سماجی ادارہ ہے۔

● — یہ ادارہ ایسے سماج کی نمائندگی کرتا ہے جس کا مقصد الٰہی نصب‌العین کو خارجی حقیقت بنانے کی کوشش ہے۔

● — اس ادارے کی ساخت میں یہ اصول مضمر ہے کہ ہر انسانی ہستی خواہ وہ کسی رنگ، نسل، زبان، وطن یا قومیت سے تعلق رکھتی ہو مخفی طاقتوں کا خزانہ ہے، جس کی خاص طریقے پر نشو و نما ہو سکتی ہے۔

● — انسانیت کے روگ کا علاج ریاست کی ظاہری شکلیں نہیں بلکہ مقاصد اور نصب‌العین ہیں۔

● — انسان کی خفیہ صلاحیتوں کی نشو و نما کے لیے ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو بہ یک وقت شاہی بھی ہو اور درویشی بھی۔

● — اقبال ایسی جمہوریت کو ناپسند کرتے ھیں جس کا آخری معیار کثرتِ رائے ھو۔

● — اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد توحید کو برپا کرنا ھے یعنی اسے انسان کی عقلی اور جذباتی زندگی میں فعال عنصر کی حیثیت میں جاری کرنا۔

● — اسلامی ریاست کے لیے بنیادی اصول یہ ھے کہ صرف اور صرف خدائے واحد کا اقتدارِ مطلق تسلیم کیا جائے۔

● — اسلامی ریاست خود اقتدار کا سرچشمہ نہیں بلکہ یہ ایک نیابتی ادارہ ھے۔

● — "اسلامی ریاست عوام سے جس وفاداری کا مطالبہ کرتی ھے، وہ اس کی اپنی ذات کے لیے نہیں ھوتی، وہ محض خدا سے وفاداری اور خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کا مطالبہ کر سکتی ھے اور کرتی ھے۔" (ص ۳۲۹)

● — اسلامی ریاست کے لیے " قرآنی اساس پر قائم رھتے ھوئے تشریحوں اور تعبیروں میں توسیع اور ترقی کی ایسی گنجائشیں ھیں، جو مکانی اور زمانی تغیرات کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتی ھیں۔" (ص ۳۳۰)

● — اسلامی ریاست میں انسانوں کو یہ حق حاصل ھے کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے خدا کی زمین سے فوائد حاصل کریں۔

● — اسلامی ریاست ضرورتوں پر قدغن نہیں لگاتی۔

● — انسان کو ملکِ خدا میں صرف اسی قدر تصرف کا اختیار ھے جو دوسروں کی تباھی کا باعث نہ ھو۔

● — جاگیرداری اور سرمایہ داری انسانی معاشرے کی لعنتیں ھیں۔

● — اسلامی ریاست انفرادی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرتی ہے لیکن نہ محنت کش کو غیرضروری اہمیت دیتی ہے نہ دولت مند کو۔

● — "اقبال کے نزدیک اشتراکیت کی خامی یہ ہے کہ اس نے سرمایہ و محنت کی کشمکش کا علاج شکمی مساوات پر رکھا اور انسانیت کی روحانی وحدت اور عمومی برادری کے تصور کو اپنے نظام فکر سے نکال دیا۔" (ص ۳۳۲)

● — اسلامی ریاست اپنی رعایا کے پانچ ابتدائی حق تسلیم کرتی ہے۔ جان کا تحفظ، مال کی حفاظت، افراد کے نسب کو غیرمعاشرتی اختلاط سے بچانا، دین کا بچاؤ اور ریاست کی خاطر انسانی عقل اور صلاحیتوں کا تحفظ۔

● — اسلامی ریاست خدا کی زمین پر خوں ریزی اور فساد ناپسند کرتی ہے۔

● — یہ ریاست تمام تر اخلاقی قیود کی پابند ہوتی ہے۔

● — ریاست کی اطاعت مشروط ہے، اِس شرط کے ساتھ کہ خود ریاست اطاعتِ حق کو شیوہ بنائے۔

بحث سمیٹتے ہوئے صاحبِ مضمون لکھتے ہیں۔[۱]

> "اقبال کی ریاست کا عام امن اور معاشی فلاح کی نگرانی کے ساتھ ساتھ پہلا فریضہ اس معاشرے کو برقرار رکھنا ہے، جس میں سے خود ریاست ابھری ہے۔ وہ معاشرے کے ترقی پذیر رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے، افراد کے لیے ترقی کے مواقع فراہم کرتی ہے،

۱۔ "معارف" نومبر ۱۹۵۴ء، جلد ۷۴، شمارہ ۵، ص ۳۴۲۔

ان کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کرتی ہے، مگر معاشرے اور افراد کو اتنا آزاد بھی نہیں بناتی کہ سرے سے اسلامی سماج ہی غائب ہو جائے؛ اسلامی سماج نہ تو جغرافیائی حدود سے بنتا ہے اور نہ زبان و نسب کے رشتے سے، بلکہ اعمال و افکار کی یک رنگی اور مقاصد کی یک جہتی پر اسلامی قومیت کا مدار ہے۔"

۱۳۔ اب تک "معارف" میں شایع ہونے والے جن مقالات کا جائزہ لیا گیا ان کا تعلق زیادہ تر اقبال کے بنیادی فلسفے سے تھا۔ ان مضامین کے علاوہ بھی متفرق موضوعات پر درجنوں مضامین "معارف" کی زینت بنتے رہے ہیں جنھیں کسی نہ کسی حوالے سے اقبالیات میں اہمیت حاصل ہے۔ یہاں نسبتاً اختصار کے ساتھ مذکورہ تحریروں پر گفتگو ہوگی۔

"معارف" مئی ۱۹۲۸ء (جلد ۲۱، شمارہ ۵) میں مولوی محمد محمود زماں کا مضمون بہ عنوان "ڈاکٹر اقبال کی اردو" شریکِ اشاعت ہے۔ موصوف نے اپنے اس مضمون میں جولائی ۱۹۲۷ء کے "مرقعِ لکھنؤ" میں شایع ہونے والی ایک مخالفانہ تحریر کا حوالہ دیا ہے مگر مصنف کے بارے میں صرف اس قدر صراحت کی ہے کہ "لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب جو متعدد کتابوں کے مصنف ہیں"۔

مولوی محمد محمود زماں معترض کے اعتراضات کی تردید سے قبل تمہید کے طور پر لکھتے ہیں۔[۱]

"اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اقبال کی اردو زبان وہ زبان نہیں جس پر سخن ورانِ لکھنؤ کو ناز ہے، ان

۱۔ "معارف" مئی ۱۹۲۸ء، جلد ۲۱، شمارہ ۵، ص ۳۶۰۔

کی شاعری ضلع جگت ، روز مرہ اور خاص خاص محاورات میں پابندی سے آزاد ہے ، اور یہ کوئی چھپا راز نہیں ، یہ چیز ہمیشہ سے سب کو معلوم ہے اور سب اس کو جانتے ہیں۔ اس کے لیے کسی نئی تحقیق ، جدید کاوش اور تازہ کشفِ حقیقت کی ضرورت نہیں۔ پابندِ وضع اور اہلِ تقلید قدیم جماعت ہمیشہ ان کی زبان پر ناک بھوں چڑھاتی رہی ہے"۔

اس تمہید کے بعد فاضل مضمون نگار کی طرف سے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے ، اور آخر میں اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ کوئی ادیب اور سخنور اغلاط سے بچا ہوا نہیں ، اس لیے محاورے اور روز مرہ کی بحثوں میں پڑنے کے بجائے شاعری کی حقیقی قدروں پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ لکھتے ہیں :۱

"ایک روشن دماغ انسان جب ان مشہور ہستیوں کے کلام پر نظر ڈالتا ہے تو محاسن کے کثیر جلوے دماغ اور نگاہ کو اس قدر خیرہ کردیتے ہیں کہ خفیف لغزشوں کی تاریکی خود بخود روپوش ہو جاتی ہے۔ دراصل شاعر وہ ہے جس کا احساس قوی ہو۔ جس شاعر کا احساس جس قدر قوی ہوگا اسی قدر اس کا کلام شعریت اور اثر سے لبریز ہوگا۔ میرے نزدیک اس معیار پر ڈاکٹر صاحب کی ذات ، ہندوستان کے تمام شعراء سے افضل ہے"۔

۱۔ "معارف" مئی ۱۹۲۸ء ، جلد ۲۱ ، شمارہ ۵ ، ص ۳۷۲۔

۱۴- "معارف" اگست، ستمبر ۱۹۳۸ء (جلد ۴۲، شمارہ ۲-۳) میں ایک مضمون ہے 'اقبال علیہ الرحمۃ کے چند جواھر ریزے' - یہ مضمون دراصل پروفیسر خواجہ عبدالحمید کی یاداشتیں اور تأثرات ھیں۔ موصوف کو علامہ سے ملنے اور ان کے ارشادات سننے کا بارھا موقع ملا - چناںچہ انھوں نے اِس تحریر کے ذریعے وہ ساری یادیں یک جا کر دیں جو درحقیقت قوم ھی کی امانت تھیں۔

۱۵- 'کلام اقبال کی دقتیں اور ان کی تشریح کی ضرورت'، یہ عنوان ہے ڈاکٹر سید عبداللہ کے اس مقالے کا جو "معارف" مارچ، اپریل ۱۹۴۴ء (جلد ۵۳، شمارہ ۳-۴) کی زینت بنا - اس میں صاحبِ مضمون نے تشریحات کلام اقبال کی ضرورت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ فکر اقبال کے سرچشموں کی نشان دھی بھی کی ہے۔

مذکورہ مقالے کے عنوانات سے اس کی اھمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: (۱) تنقیدی مطالعے کی ابتدا یورپ میں (اقبال کے مغربی ناقدین کا حوالہ دیا گیا ہے)- (۲) ھندوستان میں مطالعۂ اقبال کی ابتداؑ (۳) مطالعۂ اقبال کی مخلصانہ کوششیں (۴) آخری دور میں علامہ اقبال کی مایوسی (۵) دقتیں اور دشواریاں (فارسی)، مخصوص اصطلاحات و تراکیب، مضمون و معانی کی دشواری، شخصیات، تضمینات، امکنہ و مقامات، استعارے) (۶) علمی مسائل کی تشریح (۷) سرچشمہ ھائے فیض (اسلام کے عقائد اصولیہ اور حکمائے اسلام کی حکمت عالیہ)۔

۱۶- "معارف" جون ۱۹۴۵ء (جلد ۵۵، شمارہ ۶) میں ڈاکٹر میر ولی الدین کا مضمون 'زمانۂ حاضر کا انسان اور اقبال' شامل

اشاعت ہے۔ مضمون نگار کے الفاظ ہیں۔۱

"اقبال کے نزدیک زمانۂ حاضر کا انسان قلب اور نظر کے امراض فاسدہ میں مبتلا ہے اور یہ امراض یوں تو بے شمار ہیں لیکن ان میں زیادہ مہلک یہ ہیں: لادینی اور تشکیک، جبر یا اپنے اختیار و آزادی کے فقدان کا احساس، لذت پرستی اور ذواقیت یا خوش باش دمے کہ زندگانی این است، کا فلسفہ۔"

۱۷۔ "اقبال کے اخلاقی تصورات" کے عنوان سے مولانا محمد عبدالسلام خاں رام پوری کا ایک مقالہ "معارف" جنوری ۱۹۴۹ء (جلد ۶۳، شمارہ ۱) کی زینت ہے۔ خود ان کے الفاظ میں مضمون کا خلاصہ درج ذیل ہے۔۲

"اگر اقبال کے کلام کا اِستقصاء کیا جائے تو بہت کم ایسے اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ رہ جائیں گے، جن پر انھوں نے مختلف انداز اور نئے نئے پیرایۂ بیان سے اپنے مخاطبین کو برانگیختہ کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ ان کے اخلاقی تصورات کی یہ قابلِ لحاظ خصوصیت ہے کہ وہ بڑی حد تک مثبت ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ایسی صفات بھی جو قطعی منفی زاویۂ نظر کی ترجمانی کرتی تھیں، اقبال نے ان کی تشریح بھی کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ خالص مثبت ہوگئی ہیں۔"

۱۸۔ محمد بشیرالحق دسنوی عظیم آبادی کا ایک دل چسپ

۱۔ "معارف" جون ۱۹۴۵ء، جلد ۵۵، شمارہ ۶، ص ۴۳۲۔

۲۔ "معارف" جنوری ۱۹۴۹ء، جلد ۶۳، شمارہ ۱، ص ۴۴۔

اور معلوماتی مضمون ' اصلاحاتِ اقبال' کے عنوان سے اگست ، ستمبر ۱۹۴۹ء (جلد ۶۴ ، شمارہ ۲-۳) کی متصل اشاعتوں میں شامل ہے۔ بعد ازاں تین سال کے وقفے سے اس کی تیسری قسط اگست ۱۹۵۲ء (جلد ۷۰، شمارہ ۲) میں شایع ہوئی۔ مذکورہ مضمون میں رسائل اور کتب کی مدد سے اصلاحاتِ اقبال کا ایک جائزہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس جائزے میں مطبوعہ مجموعہ ہائے کلام اور رسائل میں شایع شدہ کلام اقبال کے درمیان اختلافات کی نشان دھی کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اپنے کلام کی لفظی و معنوی اصلاح اور بہتری کے لیے ہم وقت کوشاں رہتے تھے۔ اس قابل قدر جائزے کی ترتیب میں فاضل مرتب نے یہ کتب اور رسائل پیش نظر رکھے ہیں: مخزن لاہور، خدنگِ نظر لکھنؤ، پنجاب ریویو، زمانہ کانپور، اقبال نامہ، کلیاتِ اقبال، مثنوی اسرارِ خودی (نقشِ اول)، مثنوی رموزِ بےخودی (نقشِ اول) اور Iqbal by Aliya Begum۔ مضمون کا تیسرا حصہ صرف اسرار و رموز کے اشعار پر مشتمل ہے۔

مضمون کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے بشیرالحق دستوی رقم طراز ہیں۔[۱]

> "اصلاحاتِ اقبال کی اشاعت سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس سے کلامِ اقبال کا تدریجی ارتقا سامنے آجائے گا اور یہ معلوم ہوگا کہ علامہ کو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کتنے دشوار گزار راستے طے کرنے پڑے"۔

'اصلاحاتِ اقبال' کی پہلی دو قسطیں معمولی اضافے کے ساتھ

۱۔ "معارف" اگست ۱۹۴۹ء، جلد ۶۴، شمارہ ۲، ص ۱۳۵۔

اگست ۱۹۵۰ء میں کتابی صورت میں منظرعام پر آئیں۔ کتاب کے آغاز میں تمہید کے عنوان سے مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک مختصر تحریر بھی شامل ہے۔ مولانا اس کتاب کے مقاصدِ تالیف کی وضاحت فرمانے کے بعد لکھتے ہیں۔۱

"اگر اس رسالے میں وجہ اصلاح بھی لکھ دی جاتی تو اس کی معنویت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا، لیکن بشیرالحق صاحب نے اس کام کو ناظرین پر چھوڑدیا ہے اور وہ خود اپنے ذوق سے وجہ اصلاح معلوم کرلیں گے"۔

۱۹۔ فلسفہ و کلام اقبال سے سرسری واقفیت رکھنے والوں اور اسلام کی عالم گیر دعوت سے ناواقف حلقوں کی طرف سے عموماً اقبال پر فرقہ پرستی کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔ اسلام سے علامہ کی والہانہ محبت اور قرآنی تعلیمات سے اکتسابِ فیض کی روش دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انھیں دیگر مذاہب و ملل سے کوئی عناد یا دشمنی ہے۔ علاوہ ازیں قومیت و وطنیت کے ضمن میں افکارِ اقبال کو کبھی انسانیت کے حوالے سے رد کیا جاتا ہے اور کبھی محدود قومیتوں کے حوالے سے نشانۂ تنقید بنایا جاتا ہے۔ ان اعتراضات کا مدلل جواب دینے اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے شاہ معین‌الدین احمد ندوی نے ایک مقالہ تحریر کیا، جس کا عنوان ہے "کیا اقبال فرقہ پرست شاعر تھے؟" تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں یہ مضمون خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۱۔ عبدالسلام ندوی: اصلاحاتِ اقبال، مرتبہ بشیرالحق دسنوی، طبع اول، بانکی پور (پٹنہ)، مکتبہ دین و دانش، اگست ۱۹۵۰ء، ص ۸۔

مذکورہ تحریر "معارف" جنوری، فروری ۱۹۵۰ء (جلد ٦٥، شمارہ ۱—۲) میں شامل ہے۔ موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں ۱:

"گو انھوں نے جابجا مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا پیام عالم گیر ہے۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ انھوں نے جارحانہ جنگ و مقابلہ کی کہیں تعلیم نہیں دی۔ وہ موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کا سیاسی غلبہ و اقتدار نہیں چاہتے تھے، اور نہ ان معنوں میں اسلامی حکومت کے داعی تھے بلکہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت سے ان کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت تھا۔"

زیر گفتگو مقالے میں جن عنوانات کے تحت دلائل جمع کیے گئے ہیں، انھیں ایک نظر دیکھنے ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فاضل مصنف نے کیسی جز رسی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ مذکورہ عنوانات درج ذیل ہیں:

اقبال اور حبِ قوم و وطن — ہندوستان کی عظمت و محبت — ہندوستان کی غلامی کا ماتم — ہندو مسلم اختلاف کا غم — کشمیر اور دوسرے خطوں کی مدح — ہندوستان کے صلحاً و اخیار سے عقیدت — اقبال اور مشرق — یورپی نیشنلزم کی مخالفت کے اسباب — وحدت و اخوت کی عالم گیر دعوت — کیا اقبال نے مسلمانوں کو حصولِ قوت اور جنگ و خوں ریزی کی تعلیم دی؟ — اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی نظام کی دعوت سے اقبال کا

۱۔ "معارف" جنوری ۱۹۵۰ء، جلد ٦٥، شمارہ ۱، ص ۴۴۔

مقصد — مذہبی حکومت سے متعلق غلط فہمی کا سبب۔

۲۰۔ "معارف" اکتوبر، نومبر ۱۹۶۳ء (جلد ۹۲، شمارہ ۴—۵) میں 'موازنۂ اقبال و غالب' کے عنوان سے جناب عبدالمغنی کا ایک مضمون دو قسطوں میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ صاحب مضمون نے سب سے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ اقبال اردو شعراً میں سب سے زیادہ غالب سے متاثر تھے، پھر لکھتے ہیں کہ انھوں نے مشرق و مغرب کی بہت سی شخصیات اور تصورات و نظریات سے اثر قبول کیا لیکن "یہ سارے علوم و اشخاص، اقبال کے فکری و فنی مقصود کے محض وسائل ہیں۔ بجائے خود اِن میں کوئی بھی مقصود نہیں۔ حتیٰ کہ رومی بھی نہیں۔ یہ سب کے سب محض ذرائع، آلۂ کار اور خام مواد ہیں۔" (ص ۲۹۱)

اِس کے بعد مقالہ نگار نے اقبال اور غالب کی مماثلتیں بیان کی ہیں، جن میں شوخیِ اندیشہ، رفعتِ خیال، ندرتِ فکر، شوکتِ اسلوب اور آتش نوائی وغیرہ شامل ہیں۔ پھر لکھتے ہیں "یہاں پہنچ کر دونوں کی مماثلت کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں — قدرت نے شعری کارنامے کی استعداد دونوں کو یکساں عطا کی تھی، لیکن اس استعداد کی تکمیل دونوں کے یہاں قطعی مختلف انداز میں ہوئی۔" (ص ۲۹۳)

جناب عبدالمغنی نے دونوں شاعروں کی فکر کا موازنہ کرتے ہوئے، دو لفظوں سے ان کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے، یعنی یقین اور تشکیک۔ غالب کے ذہنی رویوں پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں "غالب اپنی فکری توانائیوں کے باوجود زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے — ان کا شعور اجتماعی درد سے خالی

تھا، اور ہموار تفکر ان کے یہاں نہیں ملتا۔ ان کے کلام میں تحریکِ عمل مفقود ہے"۔ (ص ۲۹۸)

فاضل مقالہ نگار نے فکر و فلسفہ کی مختلف جہتوں اور شعری محاسن کے حوالے سے غالب پر اقبال کو فوقیت دی ہے۔

۲۱۔ "معارف" کا یہ جائزہ چوں کہ ابتدائی سو جلدوں کا احاطہ کرتا ہے؛ اس لیے اب ہم صرف ایک مضمون کا اور ذکر کریں گے جو سوویں جلد میں شایع ہوا ہے۔ جولائی ۱۹۶۷ء (جلد ۱۰۰، شمارہ ۱) میں مدیر "معارف" سید صباح‌الدین عبدالرحمان کی تحریر بہ عنوان 'حضرت سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال' شامل ہے۔ اس جامع مضمون میں دونوں ہستیوں کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالنے کے لیے سید سلیمان ندوی کی متفرق تحریروں اور علامہ کے خطوط سے مدد لی گئی ہے۔

ان مقالات کے علاوہ بھی "معارف" کے دامن میں چند نایاب گہر موجود ہیں لیکن بالفعل ان تک رسائی ممکن نہ ہو سکی، اس لیے یہاں ان کا تفصیلی جائزہ پیش نہیں کیا جا سکا، البتہ عنوانات درج کیے جا رہے ہیں تاکہ موضوعات سے متعلق ایک اندازہ لگایا جاسکے۔

- 'اقبال اور تصورِ فقر' از میر ولی‌الدین، جولائی ۱۹۴۸ء (جلد ۶۲، شمارہ ۱)۔
- 'اقبال کا پیغامِ عمل' از مرزا صفدر علی، جون ۱۹۵۷ء (جلد ۷۹، شمارہ ۶)۔
- 'اقبال کا فوق البشر' از مرزا صفدر علی، اکتوبر ۱۹۵۷ء (جلد ۸۰، شمارہ ۴)۔

● 'اقبال اور حدیثِ نبوی ص' از اکبر حسین قریشی، جولائی ۱۹۶۱ء (جلد ۸۸، شمارہ ۱)۔

(۲)

اقبال سے "معارف" کی بڑھی ہوئی نزدیک کیجے کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بارے میں حاصل ہونے والی ہر اطلاع اور تبصرہ اس رسالے میں خاص اہتمام سے شایع کیا جاتا ہے۔ علامہ کی مختلف کتابیں اور علمی اور ادبی سرگرمیاں "معارف" کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ کتبِ اقبال کے تذکروں اور تبصروں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱- اپریل ۱۹۱۸ء (جلد ۲، شمارہ ۱۰) میں 'رموزِ بےخودی' پر تبصرہ موجود ہے۔ باب التقریظ والانتقاد کے تحت یہ تبصرہ سید سلیمان ندوی کا تحریر کردہ ہے۔۲ 'رموزِ بےخودی' پر گفتگو کا

۱- "معارف" کی اولین دس جلدوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے مقالہ 'رسالہ معارف اور اقبال' از ڈاکٹر نجم‌الاسلام، "نقوش" لاہور، جون اور ستمبر ۱۹۷۷ء۔

۲- اقبال کے خطوط نمبر ۳، ۵ اور ۷ (بحوالہ اقبال نامہ، طبع اول، لاہور، ۱۹۴۵ء) میں بھی مثنوی 'رموز بے خودی' کا ذکر موجود ہے۔ سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ تبصرے کا ذکر کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں"۔ "معارف میں آپ کا ریویو نظر سے گزرا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے"۔ (۱۰ مئی ۱۹۱۸ء، لاہور)۔ ایک اور خط میں لکھتے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۸ پر)

آغاز کرتے ہوئے سید صاحب اسرار و حقائق کی تعلیم کے لیے چار ذرائع کا ذکر کرتے ہیں یعنی مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری۔ پھر لکھتے ہیں کہ اسلام میں جب تک عربی عنصر غالب رہا یہ چاروں راستے جدا جدا رہے لیکن بعد ازاں عجمیت کے زیرِ اثر ان کے درمیان فرق اور فاصلہ ختم ہوکر رہ گیا۔ پہلے حکیم سنائی اور پھر مولانا روم نے یہی طرز اختیار کیا۔ چوتھی صدی سے دسویں صدی تک کے شعرا نے جاکمانہ جوش و خروش کو اعتدلال پر لانے کی سعی کی، دور حاضر تک پہنچتے پہنچتے ہمارے لہو کی حرارت، برودت کے درجے تک آ گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد علامہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۱

> "زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو ان شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اِس لغزشِ مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں۔ مصرعوں

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۷ سے)

ہیں۔ "رموزِ بے خودی کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا۔ اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، امید کہ توجہ فرمائی جائے گی تاکہ میں دوسرے ایڈیشن میں آپ کے خیالات سے مستفید ہو سکوں۔"

(۸ دسمبر ۱۹۱۸ء، لاہور)۔

۱۔ "معارف" اپریل ۱۹۱۸ء، جلد ۲، شمارہ ۱۰، ص ۳۰۷۔

کے در و بست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے ، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اترے ۔ شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب ، فلسفے ، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں۔ اور اس لیے اختلافِ مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا۔"

تبصرے کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے ۔[۱]

"یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فنِ قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید علمِ کلام کی ایک بہترین کتاب ہے ۔ توحید کا ثبوت ، رسالت کی ضرورت ، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب اور قبلے کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پراثر اور تشفی بخش دلائل اس کے اندر موجود ہیں۔"

۲- ۱۹۱۱ء میں پرنسپل علی گڑھ کالج کے ایما پر اقبال نے ایک لیکچر دیا تھا ، جس کا عنوان تھا ' ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'۔ یہ لیکچر انگریزی میں دیا گیا تھا ۔ بعد میں مولانا ظفرعلی خاں نے اسے اردو میں منتقل کیا۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر "معارف" اپریل ۱۹۲۰ء (جلد ۵ ، شمارہ ۴) میں تبصرہ کیا گیا ہے ۔ مختصر تبصرے میں لیکچر کے مندرجات کا خلاصہ دیا گیا ہے ۔

۱- "معارف" اپریل ۱۹۱۸ء ، جلد ۲ ، شمارہ ۱۰ ، ص ۳۰۷ ۔

۳- "معارف" دسمبر ۱۹۲۰ء (جلد ۶ ، شمارہ ۶) میں سید سلیمان ندوی نے شذرے کے ذریعے 'اسرارِ خودی' کے انگریزی ترجمے کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ترجمہ معروف مستشرق پروفیسر نکلسن نے کیا تھا۔

۴- اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے پر تفصیلی تبصرہ "معارف" مارچ ۱۹۲۱ء (جلد ۷ ، شمارہ ۳) میں شایع ہوا ہے۔ تبصرے کے آغاز میں سید سلیمان ندوی اہلِ مشرق کی غلامانہ ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اپنے ان مول جواہرات کی قدر اس وقت جانتے ہیں جب آقایانِ یورپ اِن سے اپنی دکان سجاتے ہیں۔ اس ضمن میں سید صاحب نے خیام اور ٹیگور کی مثال دی ہے پھر اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب تک ان کی عظمت کا صحیح طور پر اعتراف نہیں کیا گیا لیکن اب 'اسرارِ خودی' کے انگریزی ترجمے سے یقیناً صورتِ حال تبدیل ہوگی۔

اس کے بعد پروفیسر نکلسن کے تحریر کردہ مقدمہ اسرارِ خودی سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں:[۱]

> "افسوس ہے کہ مترجم نے نظم کا ترجمہ نثر میں کیا ہے۔ اس سے ڈر ہے کہ شاعری کی لطافت دور ہوکر یہ مثنوی دوسری زبانوں میں فلسفے کی کوئی بوجھل کتاب نہ بن جائے"۔

۵- "معارف" جون ۱۹۲۱ء (جلد ۷ ، شمارہ ۶) میں 'اسرارِ خودی' کے انگریزی ترجمے پر انگلستان کے ادبی رسالے اتھینیم کا تبصرہ اردو میں منتقل کرکے دیا گیا ہے۔

۱- "معارف" مارچ ۱۹۲۱ء ، جلد ۷ ، شمارہ ۳ ، ص ۲۲۷۔

۶۔ 'اسرارِ خودی' پر ایک اور انگریزی تبصرے کا ترجمہ "معارف" ستمبر ۱۹۲۱ء (جلد ۸، شمارہ ۳) میں دیا گیا ہے۔ پروفیسر نکلسن کے ترجمے پر ڈکنسن کا یہ ریویو انگلستان کے ہفت وار رسالے نیشن میں شایع ہوا تھا۔[۱]

۷۔ 'انھینیم' اور 'نیشن' کے تبصروں پر اقبال کے جوابی مکتوب بنام نکلسن کا اردو ترجمہ "معارف" اکتوبر ۱۹۲۱ء (جلد ۸، شمارہ ۴) میں چھپا ہے۔ اِس خط میں اقبال نے اپنے ذہنی ارتقا کے حوالے سے، اپنی فکر کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے اور اسلام کے بارے میں مبصرین کے خیالات کی تردید بھی کی ہے۔

۸۔ "معارف" مئی ۱۹۲۲ء (جلد ۹، شمارہ ۵) اور جون ۱۹۲۳ء (جلد ۱۱، شمارہ ۶) میں 'پیام مشرق' کی ترتیب و تکمیل کی خبر اور اس پر مختصر تبصرہ شایع ہوا ہے۔

۱۔ "معارف" جنوری ۱۹۲۶ء (جلد ۱۷، شمارہ ۱) میں اکرام‌الحق سلیم ڈکنسن کے اس تبصرے کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں: "اقبال کا فلسفہ خالص اسلامی فلسفہ ہے اور اقبال کا تخیل اور احساس اسلام سے وابستہ ہے؛ ڈکنسن صاحب اور ان کے ہم خیال نقاد فلسفۂ اقبال کو یورپ کے فلسفے کے زیر اثر ٹھہرانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں اور ان کے 'نائب خدا' کے تخیل کو نیٹشے کے 'فوق الانسان' کا مرہون منت کیوں نہ سمجھیں، مگر لا حاصل، سوائے اس کے کہ ان کی لاعلمی ثابت ہو اور کوئی مفاد نہیں"۔ (مقالہ 'فلسفۂ اقبال' ص ۹۴) "معارف" میں شایع ہونے والی ۱۹۲۶ء کی یہ تحریر اس رسالے کے تصورِ اقبالیات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

مکتوباتِ اقبال میں بھی اِس اطلاع اور تبصرے کا حوالہ موجود ہے۔ ۱۴ مئی ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔۱

"گوئٹے (شاعر جرمنی) کے مغربی دیوان کے جواب میں میں نے ایک مجموعہ فارسی اشعار کا لکھا ہے۔ عنقریب شایع ہوگا۔ اس کے دیباچے میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر کیا ہے۔"

"معارف" میں تبصرے کی اشاعت کے بعد ۵ جولائی ۱۹۲۴ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں۔۲

"پیامِ مشرق پر جو نوٹ آپ نے 'معارف' میں لکھا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

پروفیسر نکلسن کا خط بھی آیا ہے۔ انھوں نے اِسے بہت پسند کیا ہے اور غالباً اِس کا ترجمہ بھی کریں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اوریجنل خیالات سے مملو ہے اور گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا قابلِ تحسین جواب ہے۔ مگر میرے لیے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابلِ افتخار ہے۔"

۹۔ کلیاتِ اقبال، دکن ایڈیشن، مرتبہ مولوی عبدالرزاق پر تبصرہ جون ۱۹۲۶ء کے شمارے میں شامل ہے۔ مبصر ہیں مولانا عبدالسلام ندوی۔

۱۔ خط نمبر ۲۵، اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، طبع اول، لاہور، شیخ محمد اشرف، (۱۹۴۵ء)۔

۲۔ خط نمبر ۳۲، ایضاً۔

۱۰- معارف مئی ۱۹۲۷ء کے شذرات میں 'زبورِ عجم' کے زیرِ طبع ہونے کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں: "فلسفۂ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفے کو مزامیرِ داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور ان کے کانوں کو زبور کا 'پردہ' رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے۔" (ص ۳۲۴)

۱۱- اقبال کے دوسرے اردو مجموعۂ کلام 'بالِ جبریل' پر سید سلیمان ندوی کا تبصرہ جون ۱۹۳۵ء کے شمارے میں موجود ہے۔ سید صاحب نے پہلے تو اِس امر پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے ایک مرتبہ پھر اردو کی طرف توجہ کی اور 'بالِ جبریل' کی مدد سے زمین پر قدم رکھا۔ اِس کے بعد مختلف منظومات کی تفصیل دی ہے۔

اِس تبصرے کا حاصل یہ سطور ہیں۔[۱]

"معنوی حیثیت سے 'بالِ جبریل' کو 'بانگِ درا' کی طرح جذبات سے معمور نہیں، جس کے پڑھنے سے طبیعت میں جوش و خروش اور ولولہ و آمادگی پیدا ہو، لیکن حکمت و معرفت اور نکتہ رسی و حقیقت شناسی کے آن مول موتیوں سے اس کے دامن بھرے ہیں۔ اس کے پڑھنے سے جوش و ولولہ نہیں جو جوانی کا خاصہ ہے، بلکہ اپنی حالت پر غور و فکر کا احساس پیدا ہوتا ہے جو عمر کی سنجیدگی اور طبیعت کی پختگی کا اقتضا ہے۔ خیالات میں رفعت، اسرارِ النہیات کی ترجمانی میں حکیمانہ گہرائی، اجتماعیات میں حیاتِ اسلامی کی

۱- "معارف" جون ۱۹۳۵ء، جلد ۳۵، شمارہ ۶، ص ۴۷۲۔

روح کی صحیح معرفت، مسلمانوں کے سامنے ان کی معیاری زندگی کی اصل تصویر کشی اور 'نوجوانانِ سعادت مند' کے پند و نصیحت میں 'پیرِ دانا' کی سی مشفقانہ حکمت آموزی ہے"۔۱

۱۲۔ "معارف" اکتوبر ۱۹۳۶ء اور اپریل ۱۹۳۷ء میں 'ضربِ کلیم' پر تبصرے ملتے ہیں۔ پہلا تبصرہ سید سلیمان ندوی کا تحریر کردہ ہے جب کہ متعلقہ شمارہ ہم‌دست نہ ہونے کے سبب دوسرے تبصرے کی تفصیل حاصل نہ ہو سکی۔ سید صاحب نے اپنی تحریر میں اِس مجموعے کو ایک 'نیا ادبی معجزہ' قرار دیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں۔۲

"حضرتِ اقبال کی شاعری، اب شاعری کی حدود سے نکل کر حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے اور 'اِنّ من الشعر لحکمۃ' (بلا شبہہ بعض شعر تو حکمت ہے: بخاری) کے خلعتِ نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے۔ اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں بلکہ عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے۔ اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت اور موعظت ہے۔ وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سنانے کے لیے نہیں بلکہ ان کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لیے ہے۔ وہ اب میدانِ جنگ کا رجز یا مسافرانِ راہ کے لیے بانگِ درا نہیں بلکہ وہ غور و

۱۔ "نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند، پندِ پیرِ دانا را" (حافظ)

۲۔ "معارف" اکتوبر ۱۹۳۶ء، جلد ۳۸، شمارہ ۴، ص ۲۴۴۔

فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبریلِ امیں کا پیام ہے"۔

(۳)

"معارف" کے سرمایۂ اقبالیات میں ایک اہم حصہ خطوطِ اقبال بنام سید سلیمان ندوی ہے۔ یہ مراسلات ایک طرف تو سید سلیمان ندوی سے ان کے علمی، ادبی اور ذاتی روابط کے آئینہ دار ہیں اور دوسری طرف ان کے مزاج، نظریات، علمی مشاغل، لفظ و خیال کی بحثوں اور فکری ارتقا وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ خطوط "معارف" سے پہلے "اقبال نامہ" (مطبوعہ ۱۹۴۵ء) میں شایع ہوچکے تھے۔ اس ضمن میں مولانا معین‌الدین احمد ندوی کی طرف سے، یہ وضاحتی نوٹ "معارف" میں مکاتیب کے ساتھ شایع ہوا ہے۔۱

> "یہ خطوط اگرچہ ان کے مجموعۂ مکاتیب 'اقبال نامہ' میں شایع ہوچکے ہیں، مگر یہ اصل میں دارالمصنفین ہی کی ملکیت ہیں اور یہیں سے ان کی نقل بھیجی گئی تھی، یہ خطوط علمی حیثیت سے بہت اہم ہیں اور اکثر ناظرینِ معارف کی نگاہوں سے نہ گزرے ہوں گے، اس لیے معارف میں بھی ان کو شایع کردینا مناسب معلوم ہوا"۔

اقبال اور سید سلیمان ندوی کے مابین یہ سلسلۂ مراسلت کب شروع ہوا؟ اس کا جواب سید صاحب کے تحریر کردہ ایک شذرے سے ملتا ہے۔ لکھتے ہیں۔۲

۱۔ معین‌الدین احمد ندوی: معارف، اپریل ۱۹۵۴ء، جلد ۷۳، شمارہ ۴، ص ۳۰۶۔

۲۔ سید سلیمان ندوی: شذرات مشمولہ 'معارف' مئی ۱۹۲۷ء، جلد ۱۸، شمارہ ۶، ص ۳۲۴۔

"ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی، اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۳ء سے قائم ہے"۔

لیکن "معارف" اور "اقبال نامہ" میں سید صاحب کے نام علامہ کا قدیم ترین خط یکم نومبر ۱۹۱۶ء کا ہے۔ اس سے قبل کے مکتوبات ناپید ہیں۔ یہ امر بھی قابل افسوس ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کے جوابی خطوط بھی دست یاب نہیں۔ "معارف" میں منشی عبدالرحمان خان کے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں۔[۱]

"ڈاکٹر اقبال مرحوم کے نام میرے جوابی خطوط کی نقل میرے پاس نہیں اور نہ اب ان کے پس ماندوں کے پاس میرے جوابات ہوں گے، اور نہ اب مجھے پوری طرح یاد ہیں، اس لیے اب ان کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی"۔

"معارف" میں شایع شدہ خطوں کی تعداد ستر ہے۔[۲] اور انھیں دس قسطوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) اپریل ۱۹۵۴ء، جلد ۷۳، شمارہ ۴ کل خطوط ۹ (ایک تا ۹)

(۲) مئی ۱۹۵۴ء، جلد ۷۳، شمارہ ۵ کل خطوط ۲ (۱۰ تا ۱۱)

۱۔ "معارف" دسمبر ۱۹۴۶ء، جلد ۵۸، شمارہ ۶، ص ۴۷۳۔

۲۔ شیخ عطاء اللہ اور ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بھی اپنی مرتبہ کتابوں میں اِسی قدر خطوط دیے ہیں، لیکن اختر راہی نے ۱۹ مئی ۱۹۳۷ء کا تحریر کردہ ایک خط مزید دیا ہے۔ آخر الذکر نے مکتوبات کی ترتیب میں معمولی رد و بدل کے ساتھ ساتھ حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔

(۳) جون ۱۹۵۴ء، جلد ۷۳، شمارہ ۶ کل خطوط ۱۳
(۱۲ تا ۲۴)

(۴) جولائی ۱۹۵۴ء، جلد ۷۴، شمارہ ۱ کل خطوط ۱۰
(۲۵ تا ۳۴)

(۵) اگست ۱۹۵۴ء، جلد ۷۴، شمارہ ۲ کل خطوط ۵
(۳۵ تا ۳۹)

(۶) ستمبر ۱۹۵۴ء، جلد ۷۴، شمارہ ۳ کل خطوط ۲
(۴۰ تا ۴۱)

(۷) اکتوبر ۱۹۵۴ء، جلد ۷۴، شمارہ ۴ کل خطوط ۵
(۴۲ تا ۴۸)

(۸) نومبر ۱۹۵۴ء، جلد ۷۴، شمارہ ۵ کل خطوط ۵
(۴۹ تا ۵۳)

(۹) جنوری ۱۹۵۵ء، جلد ۷۵، شمارہ ۱ کل خطوط ۱۲
(۵۴ تا ۶۵)

(۱۰) مارچ ۱۹۵۵ء، جلد ۷۵، شمارہ ۳ کل خطوط ۵
(۶۶ تا ۷۰)

اِن خطوط کے مندرجات پر کافی کام ہو چکا ہے، پھر بھی ایک مبسوط جائزے کی ضرورت باقی ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن، جناب اختر راہی اور ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اقبال اور سلیمان ندوی کے باہمی تعلقات کی روشنی میں جائزے ترتیب دیے ہیں۔ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے 'مکاتیبِ اقبال کا تنقیدی جائزہ' میں متن کی درستی کے علاوہ بڑی محنت سے حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔

یہ مکتوبات موضوع اور لوازمے کے لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں:

(۱) ذاتی معاملات۔
(۲) دینی مسائل پر استفسارات۔
(۳) ادبی تصریحات۔
(۴) حکمائے اسلام کے فلسفیانہ افکار سے متعلق تبادلۂ خیال۔

(۴)

"معارف" میں کلامِ اقبال اگرچہ کم شایع ہوا ہے؛ مگر ہمیشہ خاص اہتمام کے ساتھ۔ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے "معارف" کے ابتدائی دنوں ہی سے حصولِ کلامِ اقبال کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اِس ضمن میں خطوطِ اقبال بنام سید سلیمان ندوی سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"انشاء اللہ 'معارف' کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی، اِس واسطے بہت کم لکھتا ہوں۔" (۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء)

"رسالہ 'صوفی' میں میں نے کوئی نظم شایع نہیں کی۔ کوئی پرانی مطبوعہ نظم انھوں نے شایع کر دی ہوگی، ورنہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں 'صوفی' کو 'معارف' پر ترجیح دوں۔ 'معارف' ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ میں انشاء اللہ ضرور آپ کے لیے کچھ لکھوں گا۔ یہ وعدہ کچھ عرصہ ہوا میں نے آپ سے کیا تھا اور میں اس وقت تک پورا نہیں کر سکا۔"
(۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء)

"چند اشعار 'معارف' کے لیے ارسالِ خدمت ہیں۔ ان

میں سے جو پسند آئے اسے شایع کیجیے۔"

(۲۳ مئی ۱۹۱۸ء)

"میں تو اپنے اشعار کو چنداں وقعت نہیں دیتا لیکن جب ایڈیٹر 'معارف' اِن کے لیے تقاضا کرتے ہیں تو شبہہ ہوتا ہے کہ شاید ایسا ہی کچھ ہو۔"

(۱۷ ستمبر ۱۹۱۹ء)

"دوسرے صفحے پر چند اشعار 'معارف' کے لیے لکھتا ہوں — اگر یہ اشعار آپ کو پسند نہ ہوں یا رسالے کے لیے آپ انھیں موزوں نہ تصور فرمائیں تو واپس بھیج دیجیے۔" (۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ء)

"معارف" کی مختلف اشاعتوں میں شامل کلامِ اقبال کی تفصیل درج کی جاتی ہے:

۱- جون ۱۹۱۸ء (جلد ۳، شمارہ ۶) میں ترانۂ اقبال کے عنوان سے سات اشعار کی غزل موجود ہے۔ علامہ نے "معارف" کے لیے یہ غزل ۱۳ مئی ۱۹۱۹ء کو روانہ کی تھی۔[۱] اِس کا مطلع ہے:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آزری

بعد ازاں یہ "بانگ درا" میں دو اشعار کے اضافے، ایک لفظی ترمیم اور عنوان کی تبدیلی کے ساتھ شایع ہوئی۔ 'میں اور تو' عنوان کے تحت یہ دو اشعار بعد کا اضافہ ہیں:

۱- مکتوبِ اقبال نمبر ۶؛ مشمولہ "اقبال نامہ"، طبع اول، لاہور، شیخ محمد اشرف، (۱۹۴۵ء)۔

دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری
نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

علاوہ ازیں چوتھے شعر میں 'راکھ' کی بجائے 'خاک' کا لفظ شامل کیا گیا ہے۔

۲۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء (جلد ۶، شمارہ ۴) میں 'پولیٹیکل گداگری' کے عنوان سے چار اشعار شریک اشاعت ہیں۔ علامہ نے یہ نظم ۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ء کو "معارف" کے لیے روانہ کی، اور اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی تحریر کی۔۱

"مدت سے یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ گزشتہ رات زکام کی وجہ سے سو نہ سکا۔ یہ تاثر ایک چھوٹی سی تضمین کی صورت میں منتقل ہو گیا — معلوم نہیں اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ واقعات صاف اور نمایاں ہیں مگر ہندوستان کے سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے اور لندن کے شیعوں (سر آغا خان) کے اشارے پر ناچتے چلے جاتے ہیں۔ افسوس مفصل عرض نہیں کر سکتا کہ زمانہ نازک ہے۔"

مکتوبِ اقبال میں پہلا شعر اس طرح ہے:

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے
مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی

۱۔ خط نمبر ۱۷، مشمولہ "اقبال نامہ"، طبع اول، لاہور، شیخ محمد اشرف، (۱۹۴۵ء)

غالباً مدیر "معارف" (سید سلیمان ندوی) نے 'خویش' کی جگہ 'خود' کا لفظ رکھ دیا ہے لیکن 'بانگِ درا' میں 'دریوزۂ خلافت' کے عنوان سے جب یہ نظم شایع ہوئی تو اس شعر کی جگہ یہ شعر شامل کر دیا گیا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

۳- "معارف" مئی ۱۹۲۲ء (جلد ۹، شمارہ ۵) میں اقبال کی مشہور نظم 'خضرِ راہ' سے اقتباس شایع ہوا ہے۔ اِس سے پہلے سید سلیمان ندوی کی طرف سے ایک تعارفی نوٹ بھی ہے جس میں مذکورہ نظم پر تبصرے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:۱

"ڈاکٹر اقبال نے مدت کے بعد امسال (اپریل ۱۹۲۲ء) انجمن حمایتِ اسلام لاہور میں اپنی زبان کھولی اور ایک نظم موسوم بہ 'خضرِ راہ' لوگوں کو پڑھ کر سنائی۔ یہ نظم ابھی چھپ کر شایع نہیں ہوئی تھی کہ ہمارے لاہور کے ایک دوست غلام جیلانی صاحب نے اپنے وجد و شوق کے عالم میں اِس نظم کی ہم سے تقریب کی اور ہمارے سامنے اُس ذوق و اثر کی تصویر کھینچی جو اس نظم کے پڑھتے وقت متکلم اور مخاطب دونوں پر طاری تھا .... ڈاکٹر صاحب کی یہ نظم گو جوشِ بیان میں ان کی پچھلی نظموں سے کم ہے لیکن

۱- سید سلیمان ندوی: "معارف" مئی ۱۹۲۲ء، جلد ۹، شمارہ ۵، ص ۳۷۶-

اُسی نسبت سے تعقید اور فارسیت میں بھی کم ہے . . .
ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ایسی ہے کہ اس کی شرح
لکھنا چاہیے ۔"

سید سلیمان ندوی کے نام علامہ کے دو خطوط میں اس نظم کا ذکر ہے ۔ ۱۳ مئی ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں ۔۱

"نظم 'خضرِ راہ' جو انجمن کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی، ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شایع ہو گئی تھی۔ میں آج دریافت کراؤں گا ۔ اگر کوئی کاپی اس کی موجود ہے تو خدمتِ والا میں ارسال کرادوں گا ۔ ساری نظم کا اب چھپنا تو ٹھیک نہیں اور نہ اس قدر گنجائش 'معارف' میں ہوگی لیکن اگر کوئی بند آپ کو پسند آجائے تو اسے چھاپ دیجیے ۔"

"معارف" میں 'خضرراہ' سے اقتباس اور اس پر تبصرے کی اشاعت کے بعد ۲۹ مئی ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں علامہ اقبال لکھتے ہیں ۔۲

"خضرِ راہ کے متعلق جو نوٹ آپ نے لکھا، اس کا شکریہ قبول فرمائیے ۔

جوشِ بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا، صحیح ہے، مگر یہ نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں) ۔ جنابِ خضر کی پختہ کاری، ان کا تجربہ اور واقعات و حوادثِ عالم پر ان کی نظر،

۱۔ خط نمبر ۳۲، اقبال نامہ، طبع اول، لاہور: شیخ محمد اشرف، (۱۹۴۵ء)۔

۲۔ خط نمبر ۲۵، ایضاً۔

ان سب باتوں کے علاوہ ان کا اندازِ طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے ۔ اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جنابِ خضر کے اندازِ طبیعت سے مناسبت نہ رکھتا تھا ۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے ۔"

۲۔ 'نغمۂ ساربانِ حجاز' کے عنوان سے اقبال کی مشہور نظم اگست ۱۹۲۳ء (جلد ۱۲ شمارہ ۲) میں شاملِ اشاعت ہے ۔ اس نظم کے آٹھ بند بعد ازاں بغیر ترمیم و اضافہ "پیامِ مشرق" میں شایع ہوئے ۔

"معارف" فروری ۱۹۲۴ء (جلد ۱۳ ، شمارہ ۲) میں مولانا گرامی ۱۔ کی اس غزل پر اقبال کی تضمین شایع ہوئی ہے ع

فقر را ترکمانیٔ ہم ہست ۔۲

اِس تضمین کے ساتھ یہ نوٹ بھی "معارف" میں موجود ہے ۔۳

۱۔ مولانا شیخ غلام قادر گرامی (متوفی ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء) فارسی کے قادر الکلام شاعر اور اقبال کے مخلص احباب میں تھے۔ مولانا کی وفات پر مدیرِ "معارف" ، جون ۱۹۲۷ء (جلد ۱۹ ، شمارہ ۶) کے شذرات میں لکھتے ہیں۔ "ڈاکٹر اقبال نے بھی جب سے فارسی میں کہنا شروع کیا ان سے استفادے میں دریغ نہیں کیا ۔ زبان کے معاملے میں وہ ان کی سند تھے ۔" (ص ۲۰۴)

۲۔ مولانا گرامی کی یہ غزل ظہوری کی اِس زمین میں ہے ۔ ع

سستم و سخت جانیٔ ہم ہست

۳۔ "معارف" فروری ۱۹۲۴ء ، جلد ۱۳ ، شمارہ ۲ ، ص ۱۴۴ ۔

"یہ سچ ہے کہ پیامِ مشرق کے ساز میں یہ لحنِ شیرازی کچھ زیادہ سامع نواز نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبال کی صدا کا ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے"۔

اس سے پہلے اقبال یکم فروری ۱۹۲۴ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں۔۱

"مولانا گرامی کی غزل میں سن چکا ہوں، اس کا ایک شعر مجھے خاص طور پر پسند آیا . . . اس شعر پر میں نے بھی تضمین کی تھی مگر 'پیامِ مشرق' میں اس واسطے داخل نہ کی کہ اس کے اشعار کی بندش کچھ بھی پسند نہ آئی۔ اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے اشاعت میں کچھ عذر نہیں"۔

مذکورہ تضمین بہ عنوان 'خلافتِ ترک و عرب' درج ذیل ہے۔

سخنے راندۂ کہ جز قرشی بر سرِ مسندِ نبی صہ نہ نشست
درس گر از گرامیؔ ہم درد کہ برید از خود و باو پیوست
رمزِ ترکِ خلافتِ عربی گفت آں مے گسار بزم الست
"ماہ را بر فلک دو نیم کند فقر را ترکمانیؔ ہم ہست"

۶۔ "معارف" اکتوبر ۱۹۳۲ء (جلد ۳۰، شمارہ ۴) میں اقبال کی ایک نظم "پیامِ اقبال بہ ملت کہسار" اس نوٹ کے ساتھ شایع ہوئی ہے۔۲

"ڈاکٹر سر اقبال نے حسب ذیل نظم ملتِ کہسار

۱۔ خط نمبر ۳۰، "اقبال نامہ"، طبع اول، لاہور: شیخ محمد اشرف (۱۹۴۵ء)۔

۲۔ "معارف" اکتوبر ۱۹۳۲ء، جلد ۳۰، شمارہ ۴، ص ۳۰۷۔

(افغانستان) کے نام ۲۴ مارچ ۱۹۳۲ء کو لکھ کر بھیجی تھی اور اب وہ جون ۳۲ء کے رسالہ 'کابل' میں چھپ کر شایع ہوئی ہے اور ہم اس کو معاصر موصوف سے مستعار لے کر یہاں شایع کرتے ہیں"۔

چھے اشعار پر مشتمل یہ مختصر فارسی نظم کلیاتِ اقبال میں موجود نہیں ہے، اس لیے یہاں تمام اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

صبا بگوئے بافغانِ کوهسار از من
بمنزلے رسد آن ملتے کہ خود نگر است

مریدِ پیرِ خراباتیانِ خود بین شو
نگاہِ او ز عقابِ گرسنہ تیز تر است

ضمیرِ تست کہ نقشِ زمانۂ تو کشد
نہ حرکتِ فلک است ایں نہ گردشِ قمر است

اگر بہ سلسلۂ کوهسار خود بنگر
کہ تو کلیمی و صبحِ تجلیٔ دگر است

بیا بیا کہ بدامانِ نادر آویزیم
کہ مردِ پاک نہاد است و صاحبِ نظر است

یکے ست ضربتِ 'اقبال' و ضربتِ فرهاد
جز ایں کہ تیشۂ ما را نشانہ بر جگر است

'ارمغانِ حجاز' میں دس اشعار کی ایک غزل ہے، جس کی زمین یہی ہے۔ مطلع یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مرا ز دیدۂ بینا شکایتِ دگر است
کہ چوں بجلوہ در آئی حجابِ من نظر است

(۵)

رسالہ "معارف" میں ابتدا ھی سے ایک گوشہ منظومات کے لیے مخصوص رہا ھے۔ "ادبیات" کے مستقل عنوان سے اشاعت پذیر ھونے والی ان شعری تخلیقات کے لیے "معارف" کے پیشِ نظر اپنا ایک معیار ھے۔ "معارف" کی نگاہ میں ادب وھی ھے جو زندگی کی تعمیر اور ترقی کا فریضہ انجام دے۔ بے مقصد ادب و انشا کے لیے اس رسالے کے صفحات میں کوئی جگہ نہیں۔ غیر افادی ادب کا تذکرہ کرتے ھوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ھیں۔۱

"اس وقت بحمداللہ ملک کے کئی گوشوں سے اردو کے اچھے اچھے اور مفید اور دل کش رسالے نکل رھے ھیں اور نکلتے جاتے ھیں اور خصوصاً ادبِ لطیف کی لعنتوں سے اردو پاک ھو رھی ھے"۔

"معارف" کے ذخیرۂ منظومات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ھوتی ھے کہ اس کے مستقل معاون شعرا میں سے کئی ایک لفظی اور معنوی سطح پر اقبال کے حلقۂ اثر میں ھیں۔ ایسے شعرا کی کاوشیں "معارف" کے مزاج اور مقاصد سے پورے طور پر ھم آھنگ نظر آتی ھیں۔ ذیل میں مشتے نمونہ از خروارے کے بطور چند تخلیقات کا جائزہ لیا جاتا ھے۔

۱۔ مارچ ۱۹۳۰ء (جلد ۲۵، شمارہ ۳) میں "بچہ اور شمع" کے عنوان سے فضل حق قرشی کا ایک مسدس شایع ھوا ھے۔ یہ نظم چھے بندوں پر مشتمل ھے اور اندازِ اقبال کی حامل ھے۔ نظم

۱۔ سید سلیمان ندوی: شذرات، مشمولہ رسالہ "معارف"، اعظم گڑھ، جلد ۱۹، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۲۷ء، ص ۳۔

کا عنوان اور ترکیب سازی کا ڈھب قابلِ توجہ ہے۔ چند شعر دیکھیے:

ہوش میں آ لیلیٰ فطرت کے سارے کام دیکھ
سوئے گلشن اک نظر کر گردشِ ایام دیکھ
دے نہ جائے تجھ کو دھوکا تیری طبعِ خام دیکھ
مقصدِ ہستی سمجھ؛ آغاز سے انجام دیکھ
رازِ پنہانی کو تو اِک مشتِ خاکستر سے سیکھ
یہ نمو خرمن کی خونِ صاعقہ پرور سے سیکھ

اس نظم میں موجود یہ تراکیب اقبال کے طرزِ خاص کی یاد دلاتی ہیں: بےخودی، طفلکِ پروانہ خو، آب و تاب زندگی، سازِ زندگی، لیلیٰ فطرت، مشتِ خاکستر اور کرمکِ شب تاب۔

۲- مئی ۱۹۳۱ء (جلد ۲۷، شمارہ ۵) میں اقبال احمد سہیل کا ۲۳ بندوں پر مشتمل مخمس بعنوان "مرگِ حیات آفریں" شایع ہوا ہے۔ دو بند ملاحظہ کیجیے:

جلوۂ ہستی ہے کیا صرف فریب سراب
زندگی مستعار کیا ہے بس اک نقش آب
اس کی حقیقت عدم اس کا وجود اضطراب
خواب ہے یہ زندگی، موت ہے تعبیرِ خواب
زندگی اک وہم ہے، موت ہے حق الیقیں

ہے یہ فریبِ حیات، پرتوِ شانِ صفات
کرتے نہیں التفات اس پہ طلب گارِ ذات
آ کہ بتاؤں تجھے سرِّ حیات و ممات
موت جسے کہتے ہیں ہے وہی عینِ حیات
قطرۂ گم گشتہ ہے بحر میں خلوت گزیں

زیرِ نظر نظم میں زندگی کو فریب ، عدم ، خواب ، سراب اور نقشِ آب قرار دیا گیا ہے۔ اِس لحاظ سے تو یہ اشعار اقبال کے تصورِ زندگی سے مطابقت نہیں رکھتے ، جن کی نگاہ میں حیات ، پیہم رواں ، ہردم جواں اور جاوداں شے کا نام ہے۔ لیکن اسلوب اور بندشِ الفاظ کے حوالے سے اثراتِ اقبال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اقبال کے طرزِ خاص میں مکالمہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ کلامِ اقبال میں مکالمے کے ذریعے بڑے بڑے فلسفیانہ مسائل کی تصریح کی گئی ہے اور بعض مقامات پر اِس سے اشیأ ، افراد یا تصورات کے مابین مقابلے اور موازنے کا کام بھی لیا گیا ہے۔ یہ انداز اقبال کے معاصرین و متاثرین میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ "معارف" جولائی ۱۹۳۴ء (جلد ۳۴ ، شمارہ ۱) میں پروفیسر محمد اکبر منیر کی چالیس اشعار پر مشتمل نظم "دریا اور ساحل" شایع ہوئی۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

تیری مدھوشی سے چرخِ نیلگوں غم ناک ہے
تیری خاموشی سے چشمِ زندگی نم ناک ہے
پلتے ہیں دل میں مرے ہنگامہ ہائے آرزو
مجھ کو دایم خوب سے ہے خوب تر کی جستجو
اِس تگ و دو میں مری ، مستور ہے رازِ حیات
کشمکش امواج کی ہے زخمۂ سازِ حیات
آہ! تو پابندِ آئینِ وفاداری نہیں
تیری موجیں آشنائے لطفِ غم خواری نہیں

۴۔ "معارف" اگست ۱۹۴۰ء (جلد ۴۶ ، شمارہ ۲) میں محمد عبدالرحمان خاں کی ایک فارسی نظم "خطاب بہ مسلمانان"

موجود ہے۔ کل ۱۴ اشعار پر مشتمل اِس نظم میں عنوان کے بعد یہ عبارت درج ہے: "بہ تتبع سر اقبال مرحوم"۔ ایک شعر نمونے کے طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے:

اے مسلمِ خوابیدہ از آوازِ اذاں خیز
دنیا ہمہ بیدار و تو در خوابِ گراں، خیز

۵- ستمبر ۱۹۴۱ء (جلد ۴۸، شمارہ ۳) میں شایع ہونے والی نظم 'جبریل و ابلیس' مکمل طور پر اثراتِ اقبال کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کا انتساب 'نوجوان مسلمان' کے نام ہے اور اس میں اشعار کی کل تعداد ۹۸ ہے۔ پروفیسر اکبر منیر نے اپنی یہ نظم انجمن حمایت‌الاسلام لاہور کے باونویں سالانہ جلسے میں پڑھی۔ ذیل کے تین شعر اقبال کی معرکہ آرا نظم 'مسجدِ قرطبہ' کی یاد دلاتے ہیں۔

عشق سے ہے تیزپا، عشق سے ہے تاب ناک
زندگیِ بے مقام، زندگیِ خوش خرام
عشق چراغِ حیات، عشق شرارِ حیات
عشق کے گلشن سے ہے حسنِ بہارِ حیات
دامنِ کہسار تھا غیرتِ باغِ خلیل
بن رہی تھی آب جو آئنۂ سلسبیل

۶- "معارف جون ۱۹۴۶ء (جلد ۵۷، شمارہ ۶) میں 'حقائق' کے عنوان سے انور کرمانی کے بارہ شعر ہیں۔ محیطِ بے کراں، ذوقِ نظر، تہذیبِ حاضر، جہاں بان و جہاں گیر، نکتۂ باریک تر، قلندر اور خودی جیسے الفاظ و تراکیب اثراتِ اقبال کی نشان دہی کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

محیطِ بے کراں ذوقِ نظر ہے
خرد لیکن ہلاکت کا بھنور ہے
حریف اس کی نہیں تہذیبِ حاضر
اناالحق نکتۂ تاریک تر ہے
جہاں بان و جہاں گیر و جہاں دار
قلندر کا فسانہ مختصر ہے
خودی جاگ اٹھی ہے خوابِ گراں سے
قفس ہمت فزائے بال و پر ہے

۷۔ 'کیفِ اضطراب' کے عنوان سے انور کرمانی کی ایک اور نظم "معارف" نومبر ۱۹۴۶ء (جلد ۵۸، شمارہ ۵) میں موجود ہے۔ نو اشعار پر مشتمل یہ مختصر نظم بھی مکمل طور پر رنگِ اقبال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بندۂ مومن، صاحبِ دو جہاں، حدیث رندی و مستی، مقاماتِ بےخودی، ضمیر، فقر اور خودی کی مخصوص لفظیات کے ساتھ ساتھ بیشتر خیالات بھی فکرِ اقبال سے ماخوذ ہیں، بلکہ ہر شعر کے مقابلے میں کلامِ اقبال سے مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ شعر دیکھیے۔

ترا ضمیر غلامی نے کردیا مردہ
وگرنہ بندۂ مومن ہے صاحبِ دو جہاں
خودی کی جلوت وخلوت کی واردات نہ پوچھ
حدیثِ رندی و مستی نہیں رہینِ بیاں
غریب تر ہیں مقاماتِ بےخودی انور
اب آرزو، نہ تمنا، نہ فکرِ سود و زیاں

۸- "معارف" مئی ۱۹۵۲ء (جلد ۶۹ ، شمارہ ۵) میں شفیق صدیقی جون پوری کی نظم ' بیانِ حقیقت ' شایع ہوئی ہے۔ نمونۃً ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

شفیقِ جون پوری کو خدا رکھے زمانے میں
اٹھا اقبال تو یہ دوسرا دانائے راز آیا

۹- اِسی شمارے میں وزیر حسن نشتر سندیلوی کی ایک نظم بعنوان "آدم" بھی شریک اشاعت ہے۔ اسلوب اقبال کے حامل تین شعر درج کیے جاتے ہیں۔

جہاں میں نکتہ سنج و نکتہ بین و نکتہ ور تو ہے
کتابِ کن فکاں کی مبتدا تو ہے خبر تو ہے
تو آیا ہے جہاں میں رازِ قدرت کا امیں ہوکر
ہے خود پیغام نازاں جس پہ وہ پیغام بر تو ہے
ستارے ہیں فلک کے تیری گردِ راہ کے ذرے
خبر تجھ کو نہیں منزل کی غافل بے خبر تو ہے

۱۰- "معارف" اپریل ۱۹۵۳ء (جلد ۷۱ شمارہ ۴) میں ' رموزِ قلندری ' کے عنوان سے نکہت شاہجہاں پوری کے بارہ شعر موجود ہیں۔ یہ اشعار نہ صرف اقبال کی زمین میں ہیں بلکہ ان کے بیشتر خیالات و تصورات بھی فکرِ اقبال کی تکرار معلوم ہوتے ہیں۔ نظم کے آخر میں اقبال کے ایک شعر کی تضمین کی گئی ہے اور اس میں موجود لفظ عشق کی وضاحت کے لیے حاشیے میں یہ عبارت درج ہے: "اِصطلاحِ اقبال میں عشق اور ایمان و یقین ہم معنی ہیں۔" یہاں مذکورہ نظم کے تین شعر پیش کیے جاتے ہیں:

خدائے عشق جو بخشے تجھے کبھی توفیق
چھپالے گوشۂ دل میں یہ نکتہ ہائے دقیق

جہانِ راز نہیں اب قلندری 'نکہت'
بقول حضرتِ اقبال صاحبِ تصدیق
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

۱۱- 'فرسودۂ خضر' کے عنوان سے قضا ابن فیضی کی نظم "معارف" اکتوبر ۱۹۵۴ء (جلد ۷۴، شمارہ ۴) میں شامل ہے۔ دو شعر تبصرے کے بغیر درج کیے جاتے ہیں:

کل خواب میں مجھ سے یہ کہا خضر نے مل کر
کیوں تیرا جنوں خام ہے اے مردِ گراں خواب
تو کر گیا اس نکتۂ روشن کو فراموش
اقوام ہوئیں جس سے جہاں گیر و ظفر یاب

۱۲- 'مقامِ مسلم' کے عنوان سے مولوی محمد سراج الحق مچھلی شہری کی ایک فارسی نظم اپریل ۱۹۵۵ء (جلد ۷۵، شمارہ ۴) میں شریکِ اشاعت ہے۔ تیس اشعار پر مشتمل اِس نظم میں عنوان کے بعد یہ عبارت درج ہے: "یہ تتبع حضرت رومی و اقبال علیہما الرحمۃ۔" تین شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہاں! یکے دریاب قدرِ خویشتن
گر نمی دانی: بیا، بشنو ز من
تو ادب آموزِ اقوامِ جہاں
تو بہ اخلاقی امامِ آستاں
تو بہ قیس ایں زماں لیلاستی
تو بہ خلدِ ایں جہاں حوراستی

۱۳- آخر میں ایک اور نظم کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ نظم "معارف" جولائی ۱۹۶۶ء (جلد ۹۸، شمارہ ۱) میں شامل ہے۔ سیّد وحیداللہ شاہ کی پندرہ ۱۵ اشعار پر مشتمل اس نظم کا عنوان ہے "لا الٰہ الا اللہ"۔ اس میں اقبال کی ایک مشہور زمین اختیار کی گئی، مگر خیالات و افکار میں کوئی ندرت محسوس نہیں ہوتی۔

تمام نور عیاں لاالٰہ الااللہ تمام سرّ نہاں لاالٰہ الااللہ

شعرائے معارف پر اقبال کے اثرات کی ایک صورت یہ ہے، جس کا اظہار منظوم خراجِ عقیدت میں ہوتا ہے مختلف شماروں میں کئی ایسی نظمیں موجود ہیں جن میں اقبال کی عظمت کا اعلان و اعتراف کیا گیا ہے۔ یہاں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ "معارف" فروری ۱۹۳۱ء (جلد ۲۷، شمارہ ۲) میں "سوال بہ اقبال" کے عنوان سے ملتان کے محمد اسد خاں کی ایک فارسی نظم شریک اشاعت ہے۔ منظوم متن سے پہلے ادارے کی طرف سے نوٹ ہے:۱

"شاعر کو ڈاکٹر سر اقبال کی اسرارِ خودی پڑھ کر جو شکوک پیش آئے ہیں وہ موزوں نغموں میں ادا ہوئے ہیں۔ صوفیانہ مثنوی گلشن راز کا وجود اسی طرح ہوا ہے۔ کہ ہمارے شاعر کے یہ شکوک ہمارے باکمال فلسفی شاعر کو ایک نئے گلشنِ راز کے کھلانے کی طرف متوجہ کریں گے۔"

سائل نے اقبال کو فلسفیٔ صاحب دل کہا ہے اور اُس کے سامنے چند نکات بغرضِ جواب پیش کیے ہیں۔ نظم اس قابل ہے کہ تمام و کمال نقل کردی جائے:

۱۔ "معارف" فروری ۱۹۳۱ء، جلد ۲۷، شمارہ ۲، ص ۱۴۳۔

پیش اِقبال برم اے اسد این مشکل خویش
هست دل در برِ من یا منم اندر دلِ خویش؟
ریختم در صدفِ جسم بگشتم گوهر
یا نیم بیشتر از حاصلِ آب و گلِ خویش ؟
پیکر از روشنیٔ من مہِ کامل شدہ است
یا بہ پیکر شدہ ام داغِ مہِ کاملِ خویش ؟
مثلِ مجنوں ہمہ تن جلوۂ عریاں باشم
یا چو لیلےٰ بشوم روشنیٔ محملِ خویش ؟
بہرِ گوہر بزنم غوطہ بہ دریائے وجود
یا بہ کشتی بروم در طلبِ ساحلِ خویش ؟
باید اوّل کہ بخواہم دلِ دانا ز خدا
یا ازاں پیش خدا را طلبم از دلِ خویش ؟
بہ تلاش خضرِ عشق ، جنوں درکار است
یا خرد را بکنم راہبرِ منزلِ خویش ؟
دارم اُمید کہ آن "فلسفیٔ صاحب دل"
بکشاید بہ کرم عقدۂ این سائلِ خویش

۲- پیام اِقبال کے عنوان سے نکہت شاہ جہاں پوری کی ایک نظم "معارف" مئی ۱۹۴۴ء (جلد ۵۳ - شمارہ ۵) میں شایع ہوئی ہے - گیارہ ۱۱ اشعار پر مشتمل نظم کا پہلا شعر ہے :

خرمنِ عقل و ہوش میں آگ سی اِک لگائے جا
کشمکشِ حیات پر برقِ عمل گرائے جا

۳- کلکتے کے عبدالرؤف صاحب کی ایک نظم بہ عنوان "اقبال" اگست ۱۹۶۳ء (جلد ۹۲ ، شمارہ ۲) میں موجود ہے - ستائیس اشعار پر مشتمل اس نظم سے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں :

وہ شاعرِ آتش نفس و عشقِ جمہور
جو شمع کے مانند ہے پُرسوز و ضیا بار
اِک تازہ جہاں شعر میں پیدا کیا جس نے
گرمیٔ معانی سے دمکنے لگے افکار
تفسیرِ حیات اس نے لکھی خونِ جگر سے
پُرسوز ہوئے دل صفتِ لالۂ کہسار
محدود نہ تھا اس کا جنوں کوہے بتاں تک
تھے زد میں سبھی دشت و چمن، ثابت و سیار
کی اس نے نئے طرز سے یوں شرح خودی کی
پوشیدہ جو اب تک تھے ہوئے فاش وہ اسرار
وہ صاحبِ اسرارِ خودی مستِ مئے شوق
بےخود بھی رہا اور خودی کا بھی نگہدار

۴۔ انیس اشعار پر مشتمل ایک اور نظم ستمبر ۱۹۶۵ء کے شمارے کی زینت ہے۔ اس کا عنوان ہے "نذرِ اقبال" اور اس کے شاعر ہیں خورشید افسر بسوانی۔ نمونے کے طور پر ایک شعر پیش کیا جاتا ہے:

جلوہ گہہِ عرش و فرش، کشتۂ پائے حیات
یہ بھی تری کائنات، وہ بھی تری کائنات

اِن مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی کے درمیان نظریات اور مقاصد کی ہم آہنگی کے سبب، اُخوت اور محبت کا جو رشتہ موجود تھا، "معارف" کے صفحات بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس ضمن میں نظم و نثر کی تخصیص نہیں۔ "معارف" نے جہاں نثر میں اقبال کی عظمت کے گن گائے ہیں وہاں منظومات کا حصہ بھی اسی لے سے معمور ہے۔

"معارف" کے شذرات میں افکار و اخبار کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے۔ اس ذخیرے میں اقبالیات سے متعلق تبصرے، تجاویز اور اطلاعات بھی ہیں۔ یہاں ان اداریوں کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ "معارف" دسمبر ۱۹۲۰ء (جلد ۶، شمارہ ۶) میں سید سلیمان ندوی کا تحریر کردہ شذرہ ہے۔ اس کا موضوع 'اسرار خودی' پر پروفیسر نکلسن کا انگریزی میں تبصرہ ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ مذکورہ مضمون کا تعارف کرایا گیا ہے البتہ تفصیلی جائزہ مارچ ۱۹۲۱ء کے "معارف" میں شایع ہوا ہے۔ اداریے کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔[۱]

> "مشرقی لٹریچر کے ہوا خواہ بالعموم اور ڈاکٹر اقبال کے کلام کے مداح بالخصوص اس خبر کو سن کر خوش ہوں گے کہ ان کی مشہور فارسی مثنوی 'اسرارِ خودی' کا انگریزی ترجمہ لندن میں چھپ کر شایع ہوگیا ہے۔ مترجم کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز مستشرق پروفیسر نکلسن ہیں جو اسلامی ادبیات و تصوف پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں، اور عربی و فارسی کی چند نادر و بیش بہا کتابیں ایڈٹ کر چکے ہیں۔ اس ترجمے پر انھوں نے بکثرت حواشی دیے ہیں اور ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ 'ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ' دو بار اس پر نوٹ لکھ چکا ہے جو علمی حلقوں میں کتاب کی اہمیت و مقبولیت کی ایک

۱۔ "معارف" دسمبر ۱۹۲۰ء، جلد ۶، شمارہ ۶، ص ۴۲۳۔

واضح دلیل ہے۔ سطورِ ہذا کی تحریر کے وقت تک کتاب ہندوستان نہیں پہنچی ہے"۔

۳۔ شذرات معارف اگست ۱۹۲۱ء (جلد ۸، شمارہ ۲) میں سید سلیمان ندوی اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔[۱]

"ٹیگور کی عزت مادرِ ہند کی عزت ہے۔ اس کا اعزاز کل ملک کے لیے موجبِ افتخار ہے۔ اور اس کی مسرت عین ہم سب کی مسرت ہے .... لیکن جس وقت تک اِس سر زمین پر ٹیگور، اکبر اور اقبال کا دم قائم ہے کون اِس کی فخر کی گردن کو جھکا سکتا ہے۔"

۴۔ جنوری ۱۹۲۲ء (جلد ۹، شمارہ ۱) کے صفحہ پانچ پر مدیر معارف، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اِس فیصلے پر کڑی تنقید کرتے ہیں کہ ولی عہد تاجِ برطانیہ اور چند دیگر سرکاری و والیانِ ریاست کو اعزازی ڈگریوں سے سرفراز کیا جائے۔ ان کے خیال میں مسلم یونی ورسٹی کی اعزازی ڈگریوں کے مستحق وہ مسلمان اہلِ علم ہیں جن کی علمی و ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ ان میں سید امیر علی، عماد الملک، سید حسین بلگرامی، جسٹس عبدالرحیم، مولوی عبدالحلیم شرر اور ڈاکٹر اقبال سر فہرست ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اِس فیصلے پر جولائی ۱۹۲۲ء (جلد ۱۰، شمارہ ۱) کے شذرات میں بھی تنقید کی گئی ہے۔ چند سال بعد جب اِس یونی ورسٹی کی طرف سے اقبال اور سید امیر علی کو اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا گیا تو "معارف" جنوری ۱۹۲۵ء

۱۔ "معارف" اگست ۱۹۲۱ء، جلد ۸، شمارہ ۲، ص ۸۲۔

جلد ۱۵، شمارہ ۱) میں مولانا عبدالسلام ندوی نے اس فیصلے کی تحسین کی۔

۵۔ حکومتِ برطانیہ کی طرف سے اقبال کو سر کا خطاب ملنے پر جنوری ۱۹۲۳ء (جلد ۱۲، شمارہ ۱) کے شذرات میں مدیر معارف اس واقعے کو 'سالِ نو کے عجائبات' میں شمار کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس امر کا شکوہ بھی کرتے ہیں کہ حکومت نے اِس جوہرِ قابل کی قدردانی میں تاخیر سے کام لیا۔

۶۔ "معارف" جون ۱۹۲۳ء (جلد ۱۱، شمارہ ۶) میں 'پیامِ مشرق' کے منظرِ عام پر آنے کی اطلاع ہے۔ اِس مجموعے کی ترتیب کے دوران مکتوبِ اقبال کے حوالے سے پہلے بھی یہ خبر "معارف" کی زینت بن چکی تھی۔ مئی ۱۹۲۲ء (جلد ۹، شمارہ ۵) میں سید سلیمان ندوی کے قلم سے یہ الفاظ درج ہیں۔۱

> "جرمنی کے ایک شاعر گوئٹے نے اپنے جس مجموعۂ اشعار کا نام 'مشرقی دیوان' رکھا ہے، مغرب کا مشرق پر اب تک یہ قرض چلا آتا تھا۔ ہمارا مشرقی شاعر اِس قرض کے بار سے مشرق کو سبک دوش کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جیسا ڈاکٹر اقبال کے والا نامے (۱۴ مئی ۱۹۲۲ء خط نمبر ۲۵) مرسلہ بنام ایڈیٹر "معارف" سے معلوم ہوا کہ انھوں نے گوئٹے کے جواب میں فارسی اشعار کا ایک مجموعہ لکھا ہے، جو عنقریب شایع ہوگا۔"

مذکورہ شذرے میں سید سلیمان ندوی اس مجموعے کے شایع ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے بطور تبصرہ لکھتے ہیں۔۲

۱۔ "معارف" مئی ۱۹۲۲ء جلد ۹، شمارہ ۵، ص ۳۷۶۔
۲۔ "معارف" جون ۱۹۲۳ء، جلد ۱۱، شمارہ ۶، ص ۴۳۲۔

"ایک سال کے انتظار کے بعد ماہِ عید، پیامِ مشرق بن کر نظر آیا۔ 'پیامِ مشرق' مختلف اوزان و بحور میں مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحرِ ذخار ہے۔ یقیناً یہ ڈاکٹر اقبال کے دماغ و قلم کا شاہ کار (ماسٹر پیس) ہے۔ اور شاید اقبال بھی اس سے بہتر کبھی نہ کہہ سکیں گے"۔

۷۔ دسمبر ۱۹۲۳ء (جلد ۱۲، شمارہ ۶) میں مدیر کی طرف سے ایک وضاحت کی گئی ہے کہ ڈاکٹر سر اقبال اور پروفیسر اقبال دو الگ الگ شخصیات ہیں۔ اسی بات کا اعادہ "معارف" فروری ۱۹۲۴ء (جلد ۱۳، شمارہ ۲) کے شذرات میں بھی کیا گیا ہے۔

۸۔ شذراتِ معارف بابت جون ۱۹۲۵ء (جلد ۱۵، شمارہ ۶) میں جرمنی کے ایک رسالے "اسلامیکا" اور اس کے موضوعات و مضامین کا ذکر کیا گیا ہے۔ ضمنی طور پر ڈاکٹر نکلسن کے اقبال پر مضمون کا حوالہ بھی موجود ہے۔ مدیرِ معارف نے ڈاکٹر نکلسن کو یورپ میں اقبال کا سب سے بڑا معترف اور مداح قرار دیا ہے۔

دسمبر ۱۹۲۵ء (جلد ۱۶، شمارہ ۶) میں 'پنجاب کے ایک مضمون نگار' کو نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے جنھوں نے غالباً اپنے مضمون میں "معارف" کے مذکورہ شذرے پر یہ اعتراضات کیے تھے۔

- "معارف" نے محض سن سنا کر "اسلامیکا" کا ذکر کردیا۔
- پروفیسر نکلسن کا مضمون اقبال پر نہیں، 'پیامِ مشرق' پر ہے۔
- یورپ میں نکلسن کے علاوہ بھی اقبال کے بیسیوں مداح موجود ہیں۔

● — "معارف" نے ' پیامِ مشرق ' پر ریویو اب تک کیوں نہیں لکھا۔

● — دسمبر ۱۹۱۱ء کی دلی کانفرنس میں ڈاکٹر اقبال کو ملک الشعرأ کا خطاب دیا گیا تھا، پھر بھی ملک کے علم برداران ادب اور ایڈیٹرانِ اخبار کا ڈاکٹر صاحب موصوف کو اس خطاب سے یاد نہ کرنا محض تعصب پر مبنی ہے۔ مگر ہم اپنے ملک کا کہاں تک گلہ کریں۔

"معارف" کی جانب سے ان الزامات و اعتراضات کو مسترد کرتے ہوئے علامہ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔[۱]

> "ڈاکٹر اقبال کی ہر حیثیت کو نمایاں کرنا ہر قدر شناس کا فرض ہے۔ اس کے لیے خود ڈاکٹر اقبال کے فضل و کمال کے علاوہ کسی اور سبب و باعث کی تقریب و تمہید کے تلاش کرنے کی حاجت نہیں۔ . . . ' معارف ' کو ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں ہمیشہ سے نیاز حاصل تھا اور ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ بانگِ درا کی اشاعت کے لیے جہاں اور ہزاروں شائقین کی فرمائشیں ہوں گی، وہاں ایڈیٹر معارف کی تحریک کو بھی دخل ہے۔ اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے پر انگریزی میں جس قدر تقریظیں نکلیں وہ 'معارف' ہی کے بدولت اردو میں پھیلیں۔ . . . ہمارے خیال میں مضمون نگار صاحب اقبال کے اصلی جوہر کو خود نہیں پہچانتے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ شہرت کی انتہا اور حسنِ قبول کا آخری

۱۔ "معارف" دسمبر ۱۹۲۵ء، جلد ۱۶، شمارہ ۶، ص ۳۰۸۔

خطاب کیا ہے، اقبال کے لیے آج بھی 'ملک الشعرا' اور 'سر' اور 'ترجمانِ حقیقت' کے نقلی خطابات کی احتیاج ننگ ہے، کمال نہیں۔ شہرت کی انتہا یہ ہے تنہا نام، ہزار شاہی القاب اور معززانہ خطابات سے بالاتر ہو جاتا ہے"

۹- شذراتِ معارف فروری ۱۹۲۶ء (جلد ۱۷، شمارہ ۲) میں ضمنی طور پر اقبال کا تذکرہ ہے۔ سیّد سلیمان ندوی کے قلم سے پہلے یہ اطلاع ہے کہ جامعۂ ترکیہ قسطنطنیہ میں ایک نئے شعبے کا آغاز ہوا ہے جس میں مسلم اقوام کے نسبی امتیاز، تاریخ، ارتقا و تنزل اور موجودہ حالات پر تحقیق ہوگی۔ اس سلسلے میں خطبے کے لیے مشہور ترک ادیب خلیل آفندی کا انتخاب ہوا ہے۔ اِس خبر کے بعد لکھتے ہیں۔[۱]

"خلیل خالد آفندی نے سیّد سجاد حیدر کے توسّط سے درخواست کی ہے کہ اس ضمن میں فضلاء اپنے خیالات سے مستفید کریں۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنے خیال کے مطابق مفصّل خاکہ لکھ کر بھیجا ہے۔ جس میں اقوامِ اسلامیہ سے متعلق ہر قسم کے مباحث ہیں۔"

۱۰- جون ۱۹۲۷ء (جلد ۱۹، شمارہ ۶) کے شذرات میں مولانا غلام محمد گرامی کی وفات پر افسوس کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ مدیرِ معارف لکھتے ہیں۔ "ڈاکٹر اقبال نے جب سے فارسی میں کہنا شروع کیا ان سے استفادے میں دریغ نہیں کیا۔ زبان کے معاملے میں وہ ان کی سند تھے۔" (ص ۳۰۲)۔

۱- "معارف" فروری ۱۹۲۶، جلد ۱۷، شمارہ ۲، ص ۸۲۔

۱۱- مئی ۱۹۲۷ء کے شذرات میں سیّد صاحب نے سفرِ لاہور کی روداد لکھی ہے۔ اس ذیل میں اقبال سے ملاقات کا احوال بھی ہے۔

۱۲- ۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور میں ادارۂ معارفِ اسلامیہ کا جلسہ ہوا جس کی صدارت اقبال نے کی۔ مئی ۱۹۳۳ء کے شذرات میں اس کی اطلاع ہے۔

۱۳- اکتوبر ۱۹۳۶ء (جلد ۳۸، شمارہ ۴۵) کے شذرات میں ضربِ کلیم پر تبصرہ ہے، جس کا ذکر اس جائزے کے دوسری حصّے میں ہے۔

۱۴- علامہ اقبال کی وفات پر سیّد سلیمان ندوی کے قلم سے مئی ۱۹۳۸ء (جلد ۴۱، شمارہ ۵) میں جو شذرہ ہے، اس کا ایک ایک حرف لایقِ مطالعہ ہے۔ یہ تحریر ایک سچّے دوست کا ماتم بھی ہے اور ایک عظیم ہمدردِ قوم کو خراجِ عقیدت بھی۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔[۱]

> "وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزّت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا اِن ساری عزّتوں سے محروم ہوگئی ہے۔ ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور صدیوں کے بعد پیدا ہو۔"
>
> "مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا وہ توحیدِ خالص کا پرستار، دینِ کامل کا علم بردار اور تجدیدِ ملّت کا طلب گار تھا۔ اُس

۱- "معارف" مئی ۱۹۳۸ء، جلد ۴۱، شمارہ ۵، ص ۳۲۲۔

کے رونگٹے رونگٹے میں رسولِ انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا اور اُس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں۔ اُس نے مستقبل کے اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا۔ اِسی خواب کی تعبیر میں اُس کی ساری عمر ختم ہوگئی۔"

"نئے زمانے کی جھوٹی آب و تاب اور نئے تمدّن کی ظاہری چمک دمک سے اُن کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں۔ آفتابِ اسلام کی ضیا باری کے مقابلے میں اُن کے سامنے جدید تہذیب و تمدّن اور زمانۂ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔"

"اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا۔ وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چین۔ بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ اِلٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھے"۔

۱۵۔ معارف مئی ۱۹۴۲ء (جلد ۵۰، شمارہ ۵) میں سید سلیمان ندوی کا تحریر کردہ شذرہ ہے، جس میں تعلیماتِ اقبال کے سلسلے میں وضاحت کی گئی ہے اور اقبالیات کے نام پر ان کے حقیقی نظریات سے انحراف کی مذمت کی گئی ہے۔ اِس تحریر کا ذکر ہم اپنے مضمون کے آغاز میں کر چکے ہیں۔

۱۶۔ "معارف" جولائی ۱۹۴۳ء (جلد ۵۲، شمارہ ۱) میں سید سلیمان ندوی نے برصغیر کی اسلامی فکری تحریکوں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اِس ضمن میں اقبال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔[۱]

۱۔ "معارف" جولائی ۱۹۴۳ء، جلد ۵۲، شمارہ ۱، ص ۳۔

"ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۶ء میں خودی و بے خودی کے اسرار فاش کیے اور مسلم کامل اور مردِ غازی کے فلسفیانہ اصول بتائے جس سے ایمانِ کامل، یقینِ محکم اور عملِ پیہم پیدا ہو، جس سے مسلم قوم کی دینی و سیاسی زندگی تکوین پائے اور اس کو روے زمین کی امامت اور پیشوائی کا درجہ حاصل ہو۔ اور یہ ثابت کیا کہ اسلام وطنیت کی حد بندی سے آزاد اور ایک ایسی حقیقت ہے جو بجائے خود مستقل اور دوسروں کی دست نگری اور آمیزش سے پاک ہے۔ اسلامی خلافت وہ ہے جو اپنے دست و بازو سے حاصل کی جائے، نہ کہ جس کی دوسروں سے بھیک مانگی جائے۔ اور یہ کہ ہندوستان میں مسلمان ایک مستقل قوم ہیں، جن کی خصوصیات، امتیازات اور تعمیری مقاصد دوسری قوموں سے بالکل الگ ہیں۔"

۱۷- شذراتِ معارف جولائی ۱۹۵۴ء (جلد ۷۴، شمارہ ۱) میں مولانا معین‌الدین احمد ندوی کے قلم سے 'بزمِ اقبال' لاہور کے سہ ماہی رسالے 'اقبال' (اردو، انگریزی) پر تبصرہ ہے۔

۱۸- اقبالیات کے معروف نقاد خلیفہ عبدالحکیم کے خیالات پر "معارف" میں کئی مرتبہ تنقید کی گئی لیکن ان کے انتقال پر مولانا معین الدین احمد ندوی کے قلم سے نہایت معتدل اور معنی خیز شذرہ نکلا ہے۔[۱]

"وہ اقبال کے فلسفے اور علمِ کلام کے بڑے عارف اور اس کے نہایت اچھے شارح اور ترجمان تھے . . . .

۱- "معارف" مارچ ۱۹۵۹ء، جلد ۸۳، شمارہ ۳، ص ۱۶۳۔

ان کی دو کتابیں فکرِ غالب اور افکارِ اقبال خاص طور سے اہم ہیں۔ مگر ان کے خیالات میں تجدد کا اثر تھا، اس لیے مذہبی تعلیمات کی ترجمانی میں ان سے غلطیاں ہوئیں، لیکن ان کی نیت نیک اور ان کے دل میں مذہب کا درد تھا۔"

۱۹۔ شذراتِ معارف اپریل ۱۹۶۶ء (جلد ۹۔، شمارہ ۴) میں سید صباح الدین عبدالرحمان نے اقبال اکیڈمی کے کام کو سراہا ہے اور اس کے سہ ماہی رسالے 'اقبال ریویو' پر مختصر تبصرہ تحریر کیا ہے۔

شذراتِ معارف کے اس پچاس سالہ جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال اور اقبالیات ہمیشہ "معارف" کے لیے اہم رہے ہیں۔ ان اداریوں میں علامہ کی علمی و ادبی حیثیت پر تحسین آمیز تبصرے بھی ہیں اور اُن کے افکار و نظریات کی وضاحت و صراحت بھی، ان کی شاعری پر اظہارِ خیال بھی ہے اور اُن کے ناقدین و شارحین کا تذکرہ بھی۔ غرض "معارف" کی نگاہ میں اقبال ایک تحریک کا نام ہے اور "معارف" اِس مشن کا علم بردار۔

(۷)

"معارف" میں موجود اقبال کے جزوی اور ضمنی تذکروں کو یک جا کیا جائے تو ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ یہاں محض چند کا حوالہ دیا جا رہا ہے کیوں کہ اس سے ہمارا مقصود صرف اس قدر ہے کہ اقبالیات سے "معارف" کی دل چسپی پر روشنی ڈالی جائے۔ ہزاروں صفحات میں پھیلے ہوئے یہ متفرق حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ اقبال سے "معارف" کا تعلق رسمی اور ظاہری نہیں

بلکہ افکارِ اقبال اِس کے رگ و پے میں لہو بن کر رواں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے :

۱— "معارف" کے اولین شمارے، جولائی ۱۹۱۳ء ہی میں اقبال کا ذکر موجود ہے۔ باب التقریظ و الانتقاد کے تحت کلامِ اکبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ضمنی طور پر علامہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور اُن کی شاعری کو جدید اردو کی تاریخ کا شاندار باب قرار دیا گیا ہے۔

۲— جون ۱۹۱۷ء کے "معارف" میں مولانا عبدالسلام ندوی نے صفحہ ۲۹ پر اقبال کے حوالے سے اُن کی وضع کردہ اصطلاح 'علم الاقتصاد' کا ذکر کیا ہے۔

۳— مارچ ۱۹۱۹ء کے شمارے میں صفحہ ۵۵۳ پر رسالہ "مخزن" کے قلمی معاونین کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال کو اکابرِ اُردو میں شمار کیا ہے۔

۴— "معارف" اگست ۱۹۲۱ء میں دو جگہ اقبال کا حوالہ موجود ہے۔ شذرات میں ٹیگور، اکبر اور اقبال کو ہندستان کا فخر کہا گیا ہے۔ اسی شمارے کے صفحہ ۱۳۲ پر مولانا عبدالماجد نے ہندستان کے نمایاں زندہ شعرأ میں اکبر کے ساتھ اقبال کا نام درج کیا ہے۔

۵— اپریل اور مئی ۱۹۲۳ء کے متصل شماروں میں محمد اختر منیر کی دو فارسی غزلیں شایع ہوئی ہیں، جن پر 'مرسلہ اقبال' کی صراحت موجود ہے۔

۶— جنوری ۱۹۲۵ء کے "معارف" میں سید منظر علی وقار کا مقالہ 'علامہ شروانی' شریک اشاعت ہے۔ اِس میں اقبال کا شمار

ان شعراً میں کیا گیا ہے جن کی نغز گوئی سے علامہ شروانی شاد کام ہوئے۔

۷۔ جلد ۱۸ کے شمارہ نمبر ۶ (دسمبر ۱۹۲۶ء) میں اکرام الحق سلیم کا مضمون ہے "جمودِ اسلام اور تصوفِ عجم"۔ مضمون کا آغاز اقبال کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

آن نہالِ سر بلند و آستوار　　مسلم صحرائی آشتر سوار
آن چنان کاہید از بادِ عجم　　ہمچو نے گردید از بادِ عجم

فاضل مضمون نگار نے اقبال کے ایک انگریزی مقالے "انا از روئے نظریۂ اضافیت" کا حوالہ بھی دیا ہے، نیز دلائل کا اختتام بھی علامہ کے ان اشعار پر ہوتا ہے:

عجم بحر یست نا پیدا کنارے　　کہ در وے گوہرِ الماس رنگ است
و لیکن من نہ رانم کشتیٔ خویش　　بدریائے کہ موجش بے نہنگ است

۸۔ جلد ۵۸، شمارہ ۶ (دسمبر ۱۹۴۶ء) میں منشی عبدالرحمان خاں کے ایک استفسار کے جواب میں سید صاحب، ڈاکٹر اقبال کے نام اپنے جوابی مکتوبات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی نقل میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔

۹۔ "معارف" کی جلد ۵۹، شمارہ ۶ (جون ۱۹۴۷ء) میں بابِ استفسار و جواب کے تحت محمد اسلم سلیم کا ایک خط شایع ہوا ہے جس میں مولانا عبدالسلام ندوی کے مقالے "اقبال کا فلسفۂ خودی" پر اعتراض کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اقبال کا رجحان روح و جسم کے میلان کی طرف نہیں بلکہ اُن کے تغایر کی جانب تھا۔ ندوی صاحب کا جواب بھی شاملِ اشاعت ہے۔ (تفصیل اِس مضمون کے حصۂ مقالات میں دیکھیے)۔

۱۰- 'قرآن اور فلسفہ' کے عنوان سے ڈاکٹر میر ولی الدین کا مقالہ جلد ۶۰، شمارہ ۲ کی زینت ہے۔ اس میں جابجا رومی اور اقبال کے کلام سے استدلال کیا گیا ہے۔ مضمون کا اختتام 'پیامِ مشرق' کے ان اشعار پر ہوتا ہے:

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگراست
بالِ بلبل دگر و بازوے شاہیں دگراست

دگر است آن کہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم
آنکہ در شیشہ بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است

اے خوش آن عقل کہ پہناے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

۱۱- "معارف" فروری ۱۹۵۵ء (جلد ۷۵، شمارہ ۲) میں قطب الدین احمد کا مقالہ ہے 'اسلام کا ذوقِ جمال'۔ لکھتے ہیں "انسان جب تخلقوا با خلاق اللہ کی قبا اپنے قامت پر درست کرلیتا ہے تو وہ بھی جلیل و جمیل بن جاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں صفاتِ الٰہی کا جابجا ذکر آیا ہے .... مردِ مومن کی عظمت کا نقشہ اقبال نے اپنے اشعار میں بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔" (ص ۱۰۹) اس کے بعد مردِ مومن سے متعلق اقبال کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔

۱۲- آخر میں اگست ۱۹۶۳ء کے "معارف" کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جلد ۹۲ کے اس شمارے میں 'تین نایاب معائنے' کے عنوان سے جناب رئیس مینائی کی ایک مختصر تحریر شایع ہوئی ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی ایک غیر مطبوعہ تحریر پیش کی گئی ہے۔ علامہ ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو مسلم لائبریری بنگلور تشریف لے گئے تھے۔ اس موقعے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جنوبی ہند کے مسلمان نوجوان اور خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے جس کو میں تمام ہندوستان

گے مسلمانوں کے لیے نیک فال تصور کرتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور مسلم لائبریری نے اس احساس کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اور امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہوجائے گا۔ اراکینِ کتب خانہ کو چاہیے کہ تاریخ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ کریں۔

(۸)

'مطبوعاتِ جدیدہ' بھی "معارف" کا ایک مستقل عنوان ہے، جس کے تحت وقتاً فوقتاً شایع ہونی والی متنوع کتب پر مختصر تبصرے کیے جاتے ہیں۔ اختصار کے باوجود یہ تبصرے متعلقہ تصانیف کے بارے میں ضروری اُمور کا احاطہ کرتے ہیں۔ مندرجات سے اختلاف کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کیا جاتا ہے۔

مذکورہ عنوان کے تحت 'اقبالیات' کے سلسلے کی جن کتب پر تبصرے کیے گئے ہیں، اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) "اقبال اور شعرِ فارسی"۔ از پروفیسر سید محمد علی، جون ۱۹۲۹ء، جلد ۲۳، شمارہ ۶۔

(۲) "مقالاتِ یومِ اقبال" مرتبہ الطاف حسین شوکت، اکتوبر ۱۹۳۹ء، جلد ۴۴، شمارہ ۴۔

(۳) "قرآن اور اقبال" از ابو محمد مصلح، جنوری ۱۹۴۱ء، جلد ۴۷، شمارہ ۱۔

(۴) یادِ اقبال" (متفرق منظومات) مرتبہ غلام سرور، مارچ ۱۹۴۱ء، جلد ۴۷، شمارہ ۳۔

(۵) "دانائے راز" از آغا شیر احمد خاموش، جولائی ۱۹۴۳ء، جلد ۵۲، شمارہ ۱۔

(۶) "Metaphysics of Iqbal" از ڈاکٹر عشرت حسن انور، جنوری ۱۹۴۶ء، جلد ۵۷، شمارہ ۱۔

(۷) "Iqbal as a Thinker" (مجموعۂ مضامین)، ناشر شیخ محمداشرف، لاہور، جنوری ۱۹۴۶ء، جلد ۵۷، شمارہ ۱۔

(۸) رموز اِقبال" از ڈاکٹر میر ولی‌الدین، اگست ۱۹۴۶ء، جلد ۵۸

(۹) "آثارِ اقبال" (مختلف مضامین) مرتبہ غلام دستگیر رشید، ستمبر ۱۹۴۶ء، جلد ۵۸، شمارہ ۳۔

(۱۰) "مقالاتِ یوم اقبال"، مرتبہ آل احمد سرور، نومبر ۱۹۴۶ء، جلد ۵۸، شمارہ ۵۔

(۱۱) "اقبال بحیثیت مفکر کے"، (متفرق انگریزی مضامین)، اقبال اکیڈمی لاہور، اپریل ۱۹۴۸ء، جلد ۶۲، شمارہ ۴۔

(۱۲) "زبورِ عجم کا انگریزی ترجم" از آرتھر جے آربری، نومبر ۱۹۴۹ء، جلد ۶۴، شمارہ ۵۔

(۱۳) "اقبال کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی"، از ڈاکٹر ظہیرالدین، ستمبر ۱۹۵۲ء، جلد ۷۰، شمارہ ۳۔

(۱۴) "روح اقبال" از ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جنوری ۱۹۵۳ء، جلد ۷۱، شمارہ ۱۔

(۱۵) "نقد اقبال" از میکش اکبر آبادی، دسمبر ۱۹۵۳ء، جلد ۷۲، شمارہ ۶۔

(۱۶) "مکاتیب اقبال" بنام خان محمد نیاز الدین خان، اگست ۱۹۵۵ء، جلد ۷۶، شمارہ ۲۔

(۱۷) "ذکرِ اقبال" از عبدالمجید سالک، فروری ۱۹۵۶ء، جلد ۷۷، شمارہ ۲۔

(۱۸) "اقبال اور مسٹر" از منشی عبدالرحمان، جنوری ۱۹۵۷ء، جلد ۷۹، شمارہ ۱۔

(۱۹) "اقبال کامل" از مولانا عبدالسلام ندوی، جنوری ۱۹۵۷ء، جلد ۷۹، شمارہ ۱۔

(۲۰) "مضامین ڈار" از پروفیسر ڈار، جون ۱۹۵۷ء، جلد ۷۹، شمارہ ۶۔
(۲۱) "فکر اقبال" مرتبہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فروری ۱۹۵۹ء، جلد ۸۳، شمارہ ۲۔
(۲۲) "اقبال کا سیاسی کارنامہ" مرتبہ محمد احمد خان، فروری ۱۹۵۹ء، جلد ۸۳، شمارہ ۲۔
(۲۳) "اقبال کا نظریۂ اخلاق" از پروفیسر سعید احمد رفیق، فروری ۱۹۶۱ء، جلد ۸۷، شمارہ ۲۔
(۲۴) "حدیثِ اقبال" از طیب عثمان، فروری ۱۹۶۲ء، جلد ۸۹، شمارہ ۲۔
(۲۵) "اسرار و رموز" از پروفیسر محمد عثمان، اپریل ۱۹۶۲ء۔
(۲۶) "اقبال کے آخری دو سال" از عاشق حسین بٹالوی، اپریل ۱۹۶۲ء، جلد ۸۹، شمارہ ۴۔
(۲۷) "روزگارِ فقیر" از فقیر وحیدالدین۔ فروری ۱۹۶۴ء، جلد ۹۳، شمارہ ۲۔
(۲۸) "روائع اقبال" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مارچ ۱۹۶۴ء، جلد ۹۳، شمارہ ۳۔
(۲۹) "اقبال اور سیاست ملی" از رئیس احمد جعفری ندوی، مئی ۱۹۶۴ء، جلد ۹۳، شمارہ ۵۔
(۳۰) "روحِ اسلام اقبال کی نظر میں" از ڈاکٹر غلام عمر خان، جولائی ۱۹۶۵ء، جلد ۹۶، شمارہ ۱۔
(۳۱) "مرقعِ اقبال" (تصاویر) از عصمت عارف علوی، اگست ۱۹۶۵ء، جلد ۹۶، شمارہ ۲۔
(۳۲) "اقبال بھوپال میں" از عبدالقوی دسنوی، اگست ۱۹۶۷ء، جلد ۱۰۰، شمارہ ۲۔
(۳۳) "انوارِ اقبال" از بشیر احمد ڈار، اکتوبر ۱۹۶۷ء، جلد ۱۰۰، شمارہ ۴۔

"معارف" نے اپنے تبصروں کے ذریعے بھی اقبالیات کا ایک رخ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مبصرین "معارف" نے ہمیشہ کلامِ اقبال کے اسلامی تشخص کو اُجاگر کیا ہے اور ایسے افکار و خیالات کی تردید میں زورِ قلم صرف کیا ہے جو کسی طرح بھی دین سے متصادم ہوں۔ اس معاملے میں رعایت کا لفظ ان کی لغت سے خارج ہے۔ صاحبِ کتاب خواہ کسی مرتبے کا ہو، "معارف" کی نگاہ میں اصولوں سے برتر نہیں۔ یہاں وضاحت کی خاطر چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

جنوری ۱۹۵۷ء (جلد ۷۹، شمارہ ۱) میں منشی عبدالرحمان کی کتاب 'اقبال اور مسٹر' پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب خلیفہ عبدالحکیم کی تصنیف 'اقبال اور ملا' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ "معارف" کے مبصر (غالباً مولانا عبدالماجد دریابادی) نے مصنف کی تائید کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم کی اس انداز میں گرفت کی ہے۔[۱]

> "مذہبی پابندیوں سے آزادی کی وبا پاکستان میں برابر پھیلتی جاتی ہے اور اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے جس کے رہنما منکرینِ حدیث اور ان کے استادِ اول مغرب زدہ طبقہ ہے اور اس کے لیے ملا ازم کی اصطلاح گھڑی گئی ہے اور ایک مستقل اینٹی ملا فرنٹ قایم ہوگیا ہے جس کا مقصد علمائے کرام کی تحقیر و تفضیح اور مذہب کی غلط تعبیر ہے اور یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسی ہستیاں بھی شامل ہیں جو کلامِ اقبال کی بہترین شارح سمجھی جاتی ہیں۔

۱۔ "معارف" جنوری ۱۹۵۷ء، جلد ۷۹، شمارہ ۱، ص ۸۰۔

چناں‌چہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اقبال اور ملا کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جو ہماری نظر سے نہیں گزرا لیکن 'اقبال اور مسٹر' میں اس کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ملا کے بارے میں اقبال کے طنزیہ اشعار نقل کیے گئے ہیں اور اس کے حاشیے میں علمائے کرام کو ہر قسم کے الزاموں اور طعن و طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے سخت خیالات ڈاکٹر صاحب کے جیسے سنجیدہ شخص کے قلم سے نکل سکتے ہیں۔ مگر تجدد کا ذوق جو بھی کرادے کم ہے۔"

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی معروف تصنیف 'فکرِ اقبال' منظرِ عام پر آئی تو "معارف" نے فروری ۱۹۵۹ء میں اس پر تبصرہ شایع کیا۔ مبصر نے خلیفہ عبدالحکیم کی مخصوص فکر پر تنقید کی اور تفہیمِ اقبال میں فروگذاشت کی طرف توجہ دلائی۔ تبصرے کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ ۱

"مصنف کے طولِ بیان، خشک اور فلسفیانہ اندازِ تحریر نے اقبال کے اُن افکار و معتقدات کو بھی جو زیادہ پیچیدہ نہیں تھے اور جنھیں دوسرے مصنفین کی تشریحات نے بہت آسان کردیا ہے، انتہائی مشکل، دقیق اور بعض مقامات میں غلط شکل میں پیش کیا ہے، وہ ایک مخصوص طرزِ فکر کے علم بردار ہیں جو

۱۔ "معارف" فروری ۱۹۵۹ء، جلد ۸۳، شمارہ ۲، ص ۱۵۵۔

> اقبال کے اسلامی طرز فکر سے مطابقت نہیں رکھتا ، اسی لیے بہت سے افکار میں اقبال کی غلط ترجمانی اور ابلیس فنون لطیفہ اور اشتراکیت وغیرہ میں اقبال کے مسلک کو اپنے خیال کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے۔ خلیفہ صاحب عجمیت کے بہت زیادہ شاکی ہیں مگر موسیقی کی حلاوت و لطافت پر جو قصیدہ انھوں نے تصنیف فرمایا ہے کیا وہ عجمی المذاق ہونے کی دلیل نہیں۔ . . . تصوف کو عجمی سازش کا نتیجہ قرار دینے اور صوفیاء پر پھبتی کسنے کے باوجود خلیفہ صاحب کو جب ان کے یہاں اپنے مطلب کی کوئی بات ملتی ہے تو اسے رنگ و روغن دے کر بیان کرتے ہیں۔ اقبال کے بعض اشعار کی آڑ لے کر انھوں نے ظواہر شریعت پر بھی طنز و تعریض اور اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے۔"

" معارف " فروری ۱۹۶۲ء میں طیب عثمانی کی کتاب "حدیث اقبال" پر تبصرہ کرتے ہوئے نوجوان مصنف کو اس امر پر داد دی گئی ہے کہ اس نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اقبال کی "اسلامیت آمیز آفاقیت" کی تشریح و تعبیر کی ہے۔ تبصرہ نگار کے الفاظ ہیں ۱۔

> " بعض ترقی پسندوں نے اقبال کو فرقہ پرست اور آفاقیت سے حجازیت کی تنگنائے میں پھنس جانے والا کہہ کر ان کی عظمت گھٹانے کی کوشش کی ہے ، اور

۱۔ " معارف" فروری ۱۹۶۲ء ، جلد۸۹ ، شمارہ ۲ ، ص ۱۵۸ ۔

بعض اُن کے دو چار اشعار سے اُن کا دامن اشتراکیت کے کانٹوں میں الجھانا چاہتے ہیں، اِس کتاب میں اِن تمام مزعومات پر بڑے اچھے انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر نوجوانوں کے بار بارمطالعے کے لایق ہے۔"

"روح اسلام اقبال کی نظر میں" ڈاکٹر غلام عمر خاں کی تصنیف ہے۔ اس کتاب پر جنوری ۱۹۶۵ء کے "معارف" میں تبصرہ شایع ہوا ہے۔ تبصرے میں تصوف کے موضوع پر مصنف کے خیالات سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے صراحت کی گئی ہے کہ اقبال اسلامی تصوف کے مخالف نہیں ہیں۔ تبصرہ نگار لکھتے ہیں۔[۱]

"اقبال تصوف کے مخالف نہیں ہیں مگر انھوں نے رہبانیت اور بدھ مت کے سنیاس سے جو اختلاف کیا ہے اس سے بعض لوگ اس کو تصوف کا مخالف سمجھ جاتے ہیں۔ خود مصنف بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں رہبانیت اور تصوف وغیرہ کا جو تقابل اور توافق نظر آتا ہے اس سے وہ تصوف مراد ہے جس کی تمام صوفیاے محققین نے مخالفت کی ہے، جس کا پنجاب اور سندھ میں رواج عام ہے۔ ان جزئیات کو چھوڑ کر کتاب میں اقبال کے نقطۂ نظر سے قریب پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے"۔

مبصرین "معارف" نے ذخیرۂ اقبالیات سے وہ حصے نمایاں طور پر پیش کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کو دین سے ازحد شغف، قرآن سے بےپناہ لگاؤ اور ذاتِ رسول صم سے بےحد محبت

۱۔ "معارف" جنوری ۱۹۶۵ء، جلد ۹۶، شمارہ ۱، ص ۸۰۔

تھی۔ مکاتیبِ اقبال بنام خان محمد نیازالدین خاں پر شایع شدہ تبصرے میں یہ حصہ ہمارے بیان کی تائید کرتا ہے۔۱

"اقبال کی ایمانی حرارت، دینی حمیت، گہری مذہبیت اور اسلام اور مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ بیشتر خطوط میں نمایاں ہے۔ حبِّ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض کیفیات نہایت مؤثر ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں "میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں، مگر زندگی تنہائی میں بسر کرتا ہوں، مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالم تخیل میں قرون اولیٰ کی سیر خیالی کیجیے کہ جس زمانے کا تخیل اتنا حسین و جمیل اور روح افزا ہو وہ زمانہ خود کیسا ہوگا"۔

"معارف" کے مختلف شماروں میں رسائل کے اقبال نمبروں پر بھی تبصرے شایع ہوتے رہے ہیں۔ ان تبصروں میں بھی "معارف" کا مخصوص اندازِ تنقید برقرار رہا ہے۔ مبصرین نے رسائل کے متنوع مضامین کا گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور اقبال کی اساسی فکر سے متصادم تحریروں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مختلف شماروں میں درج ذیل رسائل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

(۱) نیرنگِ خیال، لاہور تبصرہ در "معارف" فروری ۱۹۳۳ء، جلد ۳۱، شمارہ ۲۔

(۲) علمی گڑھ میگزین، " جولائی ۱۹۳۸ء، جلد ۴۲، شمارہ ۱۔

(۳) سب رس، حیدرآباد دکن " جولائی ۱۹۳۸ء، جلد ۴۲، شمارہ ۱۔

۱۔ "معارف" ستمبر ۱۹۵۰ء، جلد ۶۷، شمارہ ۳، ص ۲۲۷۔

(۴) رسالہ اردو، دھلی " فرووی ۹ ۱۹ ۱ء،
جلد ۳۴ ، شمارہ ۲۔
(۵) جوھر ، دھلی تبصرہ در "معارف" اگست ۱۹۳۹ء؛
جلد ۴۴ ، شمارہ ۲۔
(٦) البیان ، امرتسر " فروری ۱۹۴۰ء ،
جلد ۴۵ ، شمارہ ۲۔
(۷) سہ ماھی اقبال ، دھلی " اپریل ۱۹۵۸ء ،
جلد ۸۱ ، شمارہ ۴۔
(۸) سیارہ لاھور " اکتوبر ۱۹٦۳ء؛
جلد ۹۲ ، شمارہ ۴۔
(۹) تحریک ، " اگست ۱۹٦۷ء ،
جلد ۱۰۰ ، شمارہ ۲۔
(۱۰) چٹان ،لاھور " اگست ۱۹٦۷ء ،
جلد ۱۰۰ ، شمارہ ۲۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مرتبہ " رسالہ اردو : اقبال نمبر" پر "معارف" کا تبصرہ قابل توجہ ھے۔۱

"سرور صاحب نے اقبال کے نکتہ چینوں کا تسلی بخش جواب دیا ھے ، لیکن ھمارے نزدیک جو لوگ الفاظ کے طلسم میں الجھے ھوئے ھیں ، اقبال کا کلام ان کے مطالعے کی چیز ھی نہیں ھے ۔اور جنھیں ان کی تعلیمات پر اعتراض ھے ، انھوں نے یا تو اس کا پورا مطالعہ نہیں کیا ھے یا اس کی روح سے نا آشنا ھیں۔ ایسے لوگ اور زیادہ لایق خطاب نہیں ھیں۔ اقبال اسلامی شاعر

۱۔ "معارف" فروری ۱۹۳۹ء ، جلد ۴۳ ، شمارہ ۲ ، ص ۱۵۱۔

تھے اور اسلام کی دی ہوئی تعلیم کی حد تک ساری دنیا کے لیے امن و آزادی کے پیامی تھے۔"

کتابیات

۱۔ اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں: "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ"، طبع اول، کراچی، اقبال اکیڈمی، ۱۹۵۵ء۔

۲۔ اختر راہی: "اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں"، طبع اول، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۷۸ء۔

۳۔ رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر: "مکاتیبِ اقبال کا تنقیدی جائزہ"، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (غیرمطبوعہ)، ۱۹۸۷ء، شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی۔

۴۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: "کتابیاتِ اقبال"، طبع اول، لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء۔

۵۔ طاہر تونسوی: "اقبال اور سید سلیمان ندوی"، طبع اول، دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۷۹ء۔

۶۔ عبدالسلام ندوی، مولانا: "اقبال کامل"، راول پنڈی، کامران پبلیکیشنز، اپریل ۱۹۸۸ء۔

۷۔ عطاء اللہ، شیخ: "اقبال نامہ"، طبع اول، لاہور، شیخ محمد اشرف، (۱۹۴۵ء)۔

۸۔ محمد بشیرالحق دسنوی عظیم آبادی: "اصلاحاتِ اقبال"، طبع اول، بانکی پور پٹنہ، مکتبہ دین و دانش، ۱۹۵۰ء۔

۹۔ نذیر احمد، ملک: "کلیدِ اقبال"، (اقبال کتابی دنیا میں)، طبع اول، بہاول پور، اردو اکادمی، سن ندارد۔

رسائل

۱۔ "معارف" اعظم گڑھ، جلد اول تا ۱۰۰۔

۲۔ "نقوش" لاہور جون، ستمبر ۱۹۷۷ء۔